ہفت روزہ

الفتح

کراچی

۲۹ جولائی
تا
۵ اگست

قیمت
ایک روپیہ

سالنامہ ۱۹۷۱ء



فہرست سالنامہ ۱۹۷۱ء

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

جلد: — ۲ شمارہ: — ۱۱

۲۹ جولائی - ۵ اگست ۱۹۷۱ء

نگران
شوکت صدیقی
محمود شام

مدیر

ارشاد راؤ

معاونین خصوصی

ابراہیم جلیس، افضل صدیقی، عبدالحمید چھاپرا

مجلسِ ادارت

وہاب صدیقی — نعیم آروی

آرٹ ایڈیٹر

غلام نبی بزمی

سرورق: — ایس اظہر علی

سالنامہ کی قیمت

مغربی پاکستان: — ایک روپیہ
ہوائی ڈاک سے: — ڈیڑھ روپیہ

مقام اشاعت
ہفت روزہ الفتح ۸۰ ڈی، نرسری کمرشل ایریا
پی ای سی ایچ ایس - کراچی - ۲۹

ایڈیٹر پبلشر: ارشاد راؤ
مطبع حقی آفسٹ پریس، لیاقت آباد کراچی

اظہارِ تشکر

"الفتح" نامساعد حالات، محدود وسائل، ناگفتہ بہ حالت کے باوجود ۲۱ مئی ۱۹۷۱ء سے دوسرے سال میں داخل ہوگیا ہے اور کاغذ کی گرانی اور کمیابی کے دور میں ہم "الفتح" کا سالنامہ آپ کی خدمت میں پیش کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں، جسے ہم اپنی محنت کا عکاس خیال کرتے ہیں۔ روایتی ایڈیٹروں کی طرح میں کسرِ نفسی سے کام نہیں لے رہا ہوں۔ اس سالنامے کو شاندار میں اس لئے کہتا ہوں کہ اپنے گرد و پیش کی مشکلات کا مجھے علم ہے۔ ان میں ایسے پرچے کا نکل آنا فخریہ امر ہی تو ہے

ان چودہ ماہ میں ہر ہفتے منگل تک یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اب کے پرچہ نکلے گا کہ نہیں۔ لیکن بدھ کو پرچہ سٹالوں پر پہنچ ہی جاتا تھا۔ اس سلسلے میں جن حضرات نے ہم سے تعاون کیا، ان کا اگر شکریہ ادا نہ کیا جائے تو احسان فراموشی ہوگی۔ پہلے تو میں اپنے رفقائے کار کا ازحد ممنون ہوں جو اخبار مالکان کی زیادتیوں کا شکار ہوتے اور "الفتح" میں کم مشاہرہ پر اور ضروری سہولتیں نہ ہونے کے باوجود ایک مشن کے تحت کام کرتے رہے۔ ان کے علاوہ احمد ندیم قاسمی، عبدالحمید عدم، فارغ بخاری، ابراہیم جلیس، افضل صدیقی اور عبدالحمید چھاپرا بھی دلی شکریے کے مستحق ہیں کہ اُن کا ہر قدم پر تعاون حاصل رہا۔ اس کے علاوہ پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو نے بھی ہماری ہر طرح حوصلہ افزائی کی۔ حئی سنز، جناب قاسم پٹیل، پرسٹیج ایڈورٹائزر، اورینٹ ایڈورٹائزر، جامعہ انڈسٹریز اگر مسلسل توجہ نہ کرتے تو ہمارے لئے پرچے کو جاری رکھنا خاصا دُشوار ہوتا۔ آخر میں آرٹ ایڈیٹر جناب غلام نبی بزمی کا شکریہ قدرے مشکل ہے کہ انہوں نے خلوص کی انتہا کردی۔ کارساز پیپر مارٹ، حقی آفسٹ پریس نے بھی گرم و سرد کی فکر کیے بغیر ہمارا ساتھ دیا ہے ہاکرز اور نیوز پیپر ایجنٹ حضرات کا دلی طور پر ممنون ہوں کہ انہوں نے الفتح کو مقبول بنانے کے لیے جانفشانی سے کام لیا۔

الہ داد

عہد نامہ ۱۹۷۱ء

ہم عہد کرتے ہیں کہ:-

مظلوم عوام کی ترجمانی کا فرض ادا کرتے رہیں گے۔ نوکر شاہی، جاگیرداری اور سرمایہ داری کا پردہ چاک کرتے رہیں گے۔ مقبوضہ صحافت کے اس تاریک دور میں اگرچہ ہمارا راستہ کٹھن، دشوار اور خار دار ہے۔ صحافت پر بڑے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا تسلط ہے۔ عوام کی ترجمانی بالواسطہ سب سے بڑا جرم بن چکی ہے۔ مگر فرض کی پکار کا تقاضا پورا کرنا ہے۔ ہم یہ راستہ بخوشی قبول کرتے ہیں۔ اور منزل تک پہنچنے کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار رہیں گے۔

ہم حمایت کرتے رہیں گے اُن تمام افراد کی جو مزدور کسان راج کے لئے گرانقدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ہمارا یہ پختہ ایمان ہے کہ حکمرانی کا منصب عوام کو زیب دیتا ہے۔ وطن عزیز کے بارہ کروڑ عوام کی آبادی مزدور اور کسان طبقے پر مشتمل ہے۔ وہی اس کے حاکم ہیں۔ ہم اُن کی جاگیرداروں، سرمایہ داروں، نوکرشاہی اور ان کے غیر ملکی آقاؤں کے خلاف جدوجہد میں برابر کے شریک رہیں گے۔

آزاد صحافت کا علم بلند رکھیں گے۔ مزدور، کسان اور طلبہ سے گہرا رشتہ ہی اس پرچم کو حیات بخش سکتا ہے۔ اس کے لئے ہم اس قول پر عمل کرتے رہیں گے۔ "تمام علم و ادب کا سرچشمہ عوام ہیں"۔

پاک چین دوستی کو مزید مضبوط بنائیں گے۔ آج چین ہی دنیا بھر کے مظلوم عوام کا واحد ایسا دوست ہے جو ان کے سب بڑے دشمن امریکی سامراج کے خلاف برسرپیکار ہے اور اور دنیا بھر کے عوام کی مسلح جدوجہد آزادی کی عملی حمایت کرتا ہے۔

آج ہم سلام پیش کرتے ہیں

اُن جیالوں کو جنھوں نے آزاد صحافت کے لئے مقبوضہ اخبارات کے وڈیروں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اس کیلئے مشکلات برداشت کیں اور معاشی بدحالی کا مردانہ وار مقابلہ کر رہے ہیں۔

ان شہیدوں کو جنہوں نے وطن عزیز کی دھرتی پر امریکی سامراج، جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور نوکرشاہی کے مظالم سہے اور شہید ہو گئے۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور مر گئے۔

ان دلیروں کو جو آج بھی ملک سے امریکی سامراج کو مار بھگانے میں مصروف ہیں۔ اور اپنے حقوق کے حصول کے لئے جدوجہد میں مصروف ہیں۔ جیلوں کی سلاخوں کے پیچھے بند پڑے ہیں اور جنہوں نے مزدور کسان راج کیلئے اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں۔

ہم ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں۔ انکے نقوش ہمارے لئے مشعلِ راہ ہیں۔



(پاکستان میں تشکیل شدہ)

قائم شدہ ۱۹۴۱

گستاخی معاف

گھر نقدی رکھنے کی جگہ تو نہیں!

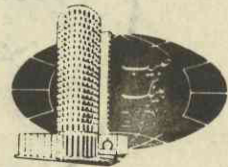
آپ کا روپیہ حبیب بینک سیونگز اکاؤنٹ میں زیادہ محفوظ ہے۔

آپ اپنے گھر میں فرنیچر اور پردے، برتن اور کپڑے اور اشیاء خورد و نوش وغیرہ بڑے شوق سے رکھیئے۔ لیکن گستاخی معاف گھر نقدی رکھنے کی جگہ تو نہیں۔

اپنے روپے پیسے کا تحفظ آپ کو یقیناً عزیز ہے۔ اسے حبیب بینک سیونگز اکاؤنٹ میں رکھیئے جہاں صرف ۵ روپے سے حساب کھُل سکتا ہے۔

حبیب بینک میں آپ کی رقم نہ صرف محفوظ رہتی ہے۔ بلکہ اس پر آپ کو منافع بھی ملتا ہے۔

حبیب بینک کی شاخیں آپ کی بہتر خدمت کے لئے ہر جگہ موجود ہیں۔



حبیب بینک لمیٹڈ

پاکستان میں ۷۵۰ سے زائد شاخیں

صوبوں کی انتظامیہ میں اہم تبدیلیاں ہونے کا امکان

آئندہ چار پانچ روز میں اہم تبدیلیاں ہونے والی ہیں۔

مشرقی پاکستان میں اب بیشتر علاقوں میں نظم و نسق فوج نے نوکرشاہی کے سپرد کر دیا ہے۔ صورت حال کو معمول پر لاتے کے لئے اب مزید تبدیلیاں کی جا رہی ہیں۔ غیر مصدقہ اطلاعات کے مطابق صوبائی گورنروں کے آپس میں تبادلے کا امکان ہے۔ اس طرح گورنروں کو دوسرے صوبوں کے حالات جاننے کا بھی موقع ملے گا۔ اور وہ ایک دوسروں کے مشوروں سے حالات پر قابو پانے کی کوششیں کریں گے۔

مغربی پاکستان کے گورنروں کی کراچی میں ہونے والی حالیہ کانفرنس میں اس امکان پر غور کیا گیا۔ اس کے بعد سرحد کے گورنر کے ایم اطہر خاں مشرقی پاکستان کے دورے پر جا رہے ہیں۔ خیال ہے کہ اس کانفرنس میں ہونیوالے فیصلوں اور مذاکرات کی تفصیلات سے وہ مشرقی پاکستان کے گورنر کو آگاہ کریں گے بعض باخبر ذرائع نے بتایا ہے کہ چونکہ مشرقی پاکستان میں حالات پر کافی حد تک قابو پایا جا چکا ہے اس لئے وہاں کے انتظامی ڈھانچے میں نمایاں تبدیلی کی جائے گی۔ غیر مصدقہ اطلاعات کے مطابق جناب عتیق الرحمٰن یا جناب کے ایم اطہر خاں میں سے کوئی ایک مشرقی پاکستان کے گورنر کا عہدہ سنبھال لیں گے۔ اور جناب ٹکہ خاں مغربی پاکستان کے کسی صوبے کے گورنر کے فرائض ادا کریں گے

یہ تبدیلیاں حالات کو معمول پر لانے اور صوبوں کے درمیان افہام و تفہیم بڑھانے کے لئے کی جا رہی ہیں۔

نوکرشاہی کے ڈھانچے میں بھی بڑے پیمانے پر تبدیلیوں کا امکان ہے۔ مشرقی پاکستان میں پیدا شدہ صورت حال کی روشنی میں اب اس بات پر غور کیا جا رہا ہے کہ نوکرشاہی کے بین الصوبائی تقرریوں سے پابندی کا سلسلہ ختم کر کے افسروں کے بغیر کسی پابندی کے تقرریاں کی جائیں۔ ایک صوبے میں صرف اسی صوبے کی شہریت رکھنے والے سرکاری افسروں کے تقرر کی پابندی۔ قومی مفادات کے حق میں نہیں رہی ہے۔ کیونکہ اس سے غیر ارادی طور پر بھی صوبائی تعصب کو ہوا ملتی ہے۔ سرکاری افسر قدرتی طور پر اپنے علاقے کے مقامی باشندوں کے مسائل کے حل کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ خبریں بھی ہیں کہ سندھ کے سرحدی علاقوں اور سرحد کے سرحدی علاقوں میں کچھ پراسرار سرگرمیوں کی تفصیلات ملی تھیں۔ خاص طور پر سندھ کے سرحدی علاقوں میں بھارت نے اپنے بعض ایجنٹوں کے ذریعے کچھ نقشے اور معلومات حاصل کرنے کی کوششیں کی تھیں۔ ان کے پیش نظر سرحدی آبادیوں میں بڑے منظم پیمانے پر نگرانی کی گئی۔ اور کچھ لوگوں کو سرحدوں سے کافی دور ہٹ کر آباد ہونے کی ہدایت کی گئی۔ اس امر کے پیش نظر سرکاری افسروں اور پولیس افسروں کے بھی بڑے پیمانے پر تبادلے کئے گئے ہیں۔ پنجاب کے ایک اعلیٰ پولیس افسر کو سندھ میں ان سرگرمیوں کی تحقیقات پر مامور کیا جا رہا ہے۔

سنا گیا ہے کہ اس کانفرنس میں یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ مجرموں کو سرِ عام کوڑے مارنے کی سزا نہ دی جائے۔ کیونکہ اس سے پنجاب میں خاص طور پر بے چینی پھیلی ہے۔ آئندہ یہ سزا نہیں دی جائے گی۔

الطاف گوہر ہارون خاندان کے ہیرالڈ پبلی کیشن میں

کراچی۔ (نمائندہ الفتح) "الفتح" کو اپنے خصوصی ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ صدر ایوب کے بدنام زمانہ انفرمیشن سیکرٹری مسٹر الطاف گوہر اور رسوائے جہاں ۳۰۳ میں سے ایک ہفتے یکے از ۲۲ خاندان —— ہارون خاندان کی ہیرالڈ پبلی کیشن سے منسلک ہو گئے ہیں۔ وہ پبلی کیشن ایڈوائزر کے طور پر فرائض انجام دیں گے۔ اس کے عوض انہیں قریباً ۴۵۰۰ روپے ماہوار مشاہرہ ملے گا۔ اس تقرری سے پہلے الطاف گوہر ایک فرم "ایسٹ ویسٹ کارپوریشن" سے منسلک تھے وہ بھی اجارہ دار سرمایہ داروں کی ایک کارپوریشن ہے اس سے پہلے بھی ۳۰۳ میں سے کئی دوسرے افسروں کو بھی اجارہ دار سرمایہ دار اپنے اداروں سے وابستہ کر کے حق نمک ادا کر رہے ہیں۔ اپنے نوکرشاہی کے زمانے میں ان افسروں نے اجارہ دار سرمایہ داروں کے فائدے کے لئے بڑے جتن کئے تھے اور یہ انہی نیک کارناموں کا صلہ ہے۔ الطاف گوہر ہیرالڈ پبلی کیشن میں ڈان، حریت، ایوننگ اسٹار کے لئے نیک مشورے دیا کریں گے۔

چین نے خوش ہوکر جسارت کو کاغذ دے دیا

درویش

ہم نے گذشتہ ہفتے ہی تو کہا تھا کہ چیئرمین ماؤزے تنگ روزنامہ "جسارت" پڑھا کریں گے۔ چیئرمین ماؤزے تنگ اتنے خوش ہوتے ہیں کہ انہوں نے روزنامہ جسارت کو چینی کاغذ بھی عنایت کر دیا ہے۔ آجکل جسارت چینی کاغذ پر شائع ہوتا ہے اور اُسے ایک کالم بھی کم کرنا پڑا ہے۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ چین نے "جسارت" سے انتقام لیا ہے۔ اب ہر روز جسارت کو چھ کالم کم شائع کرنے پڑتے ہیں یعنی ایک ہفتے میں کم از کم ۵۰ کالم کم۔ یوں "جسارت" کی بائیں بازو کی مخالفت میں کم از کم ۵۰ کالم کی کمی ہوگئی۔ یہ چین کی جسارت کے خلاف سازش نہیں تو اور کیا ہے۔

ہفت روزہ "زندگی"

بھٹو کے دل کی بات سمجھنے لگا

اب کے "زندگی" نے سرورق پر مسٹر بھٹو کی تصویر شائع کی ہے اور اس کے نیچے لکھا ہے :-

"مجھے اقتدار دیجئے، میں بھارت سے دوستی کرلوں گا" مسٹر بھٹو کا ارشاد

☆

یہ نتیجہ جس متن سے برآمد کیا گیا ہے وہ کیہان انٹرنیشنل کا مسٹر بھٹو سے انٹرویو کا حصّہ ہے۔

طاہری، آپ کا ذکر بعض اوقات بھارت کے بدترین دشمن کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ کیا آپ اپنے آپکو اس قابل سمجھتے ہیں کہ جب بھی آپ کی پارٹی کی حکومت قائم ہو تو بھارت سے مصلحت کر سکیں۔

بھٹو۔ سیاسیات میں "بدترین دشمن" جیسی کوئی بات نہیں ہوتی۔ آپ کا وزیر خارجہ صرف دو سال پہلے مصر کے بدترین دشمن کی حیثیت سے مشہور تھا۔ آج وہ مصر کا محبوب نظر ہے اور اس نے ایران اور مصر کے درمیان گہری دوستی قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ بس نہیں سمجھتا، میں کیوں ہندوستان کے ساتھ مصالحت کرنے کے قابل نہیں ہوں گا۔ وقت بتائے گا کہ اس سلسلے میں کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔"

☆

یہ متن ہے اور وہ زندگی کے نابالغ ایڈیٹر کی تفسیر تھی۔ یہی ان کے پیر و مرشد مولانا مودودی کی تفسیر کا انداز ہے۔ زندگی کے ایڈیٹر پہلے مزاج شناسِ مودودی تھے۔ اب "مزاج شناسِ بھٹو" بننے لگے ہیں۔ بھٹو نے اپنے انٹرویو میں جو بات کہی وہ انھوں نے محسوس کرلی ہے

زندگی کے رپورٹر۔ سی آئی ڈی کے رپورٹر

ہفت روزہ "زندگی" میں مسٹر بھٹو کی لاہور میں صحافیوں سے ملاقات کی اور رُوداد ایک ظفر اعوان نامی رپورٹر نے لکھی ہے۔ لکھتے ہیں :-

"بعد ازاں منتظمین کو جناب بھٹو نے بطورِ خاص ہدایت کی کہ دروازے پر ایک آدمی کھڑا کر دیا جائے تاکہ سی آئی ڈی والے ایڈیٹ غیر ضروری طور پر اندر نہ آنے پائیں"۔ میں اُن کی اس غیر ضروری احتیاط پر دل ہی دل میں ہنسنے لگا، کیونکہ ایسے کتنے ہی ایڈیٹ رکسی اور حیثیت سے سہی، اندر بیٹھے تھے۔"

دیکھیے کیا خوبصورتی سے "ایڈیٹ" ہونے کا اعتراف کر لیا۔ واقعی مسٹر بھٹو غیر ضروری احتیاط کر رہے تھے۔ سی آئی ڈی کے ایڈیٹ تو زندگی کے رپورٹر کی حیثیت سے اندر بیٹھے تھے۔ اور دل ہی دل میں ہنس رہے تھے۔ اور بعد میں انھوں نے یہ رپورٹ سی آئی ڈی کو پہلے پہنچائی تھی، زندگی کو بعد میں۔ جیسے کہ اُن کے ایک ساتھی "مشرق" کے رپورٹر یہ کام کرتے ہیں۔ اُن کی تصویر بھی اب کے "الفتح" میں ان کے "ہم پیشہ" حضرات کے ساتھ دی جا رہی ہے۔

دوسرے صفحات کی تصحیح

فارغ بخاری کی غزل (صفحہ ۲۱ پر) کا مصرعہ "فارغ گھٹن حواس کی دوچند ہوگئی" کی بجائے فارغ گھٹن حواس کی دوچند ہوگئی چھپ گیا ہے۔ قارئین کرام تصحیح فرمالیں۔

- فلم ساز و ہدایت کار ضیا سرحدی کی یادداشتیں صفحہ ۸۳ میں فلمی اداکارہ سبیتا کی جگہ سیتا لکھ دیا گیا ہے۔ قارئین کرام اسے سبیتا پڑھیں۔

سالنامے کا دوسرا ایڈیشن

کاغذ کی قلت اور سفید کاغذ کی ناقابل برداشت گرانی کی وجہ سے سالنامہ محدود تعداد میں شائع کیا گیا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ایجنٹ حضرات کو مطلوبہ تعداد میں کاپیاں مل جائیں۔ تاہم سالنامے کی مانگ کے پیش نظر مارکیٹ میں کمی محسوس کی جائے گی۔

ایجنٹ حضرات

سے درخواست ہے کہ وہ اپنے اپنے قارئین کی مانگ پورا کرنے کے لئے ہمیں اپنے آرڈر ایک ہفتے کے اندر اندر بھیج دیں تاکہ دوسرا ایڈیشن شائع کیا جا سکے۔ کاغذ کی گرانی کے پیش نظر ہم اپنے ایجنٹ حضرات سے ملتمس ہیں کہ وہ مطلوبہ تعداد کی رقم پیشگی بصورت ڈرافٹ ارسال کریں تو آرڈر کی تعمیل میں آسانی رہے گی۔

جنرل منیجر ہفت روزہ الفتح کراچی

صنعتی ترقی کی رفتار تیز کرنے والی کمیٹی خود فیل ہو جائیگی

عبدالمجید چھاپرا

صدرِ پاکستان نے ملکی معیشت کے جمود اور صنعتی ترقی کی رفتار سست ہونے کی وجوہ معلوم کرنے کے لئے منصوبہ بندی کمیشن کے چیف اکنامسٹ کی سربراہی میں ایک کمیٹی تشکیل دی ہے جو موجودہ درآمدی پالیسی کے دائرۂ کار میں رہتے ہوئے صنعتی سرگرمیوں کی رفتار تیز کرنے کے لئے اپنی سفارشات پیش کرے گی۔ شروع میں یہ کمیٹی تین بڑی صنعتوں کاٹن ٹیکسٹائلز، جوٹ ٹیکسٹائلز اور سرمایہ کی اشیاء کی صنعت کا جائزہ لے گی۔ اس کے بعد یہ کمیٹی دوسری صنعتوں کی ترقی کی رفتار تیز کرنے کے لئے اقدامات پر غور کرے گی۔

صدر کے اس اقدام سے نجی شعبے کا ایک دیرینہ مطالبہ پورا ہوگا، جس کے تحت معیشت کے اہم شعبوں سے متعلق پالیسیوں پر نظرِ ثانی اور انھیں تبدیل کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا۔ کمیٹی کے دیگر ارکان میں وزارتِ صنعت کے جوائنٹ سیکرٹری، وزارتِ تجارت کے جوائنٹ سیکرٹری برائے درآمدات محکمہ فروغ سرمایہ کاری اور سپلائز کراچی کے ڈائریکٹر جنرل اور مرکزی دفتر شماریات کے ڈائریکٹر جنرل اس میں شامل ہوں گے۔ جب کہ منصوبہ بندی کمیشن میں بین الاقوامی اقتصادیات کے شعبے کے سربراہ اس کمیٹی کے ممبر سیکرٹری ہوں گے۔ (ایک خبر)

صدر کی جانب سے اقتصادی بحران پر قابو پانے کے لئے کمیٹی کا قیام ایک مستحسن اقدام ہے۔ لیکن اس کمیٹی کے تمام ارکان اعلیٰ سرکاری افسران ہیں۔ جو ایک مدت سے چلنے والے فرسودہ افسر شاہی نظام کے تحت کام کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ لہٰذا ملکی معیشت کی رفتار کو تیز کرنے اور معیشت کے جمود کو ختم کرنے کے لئے جن ضروری تبدیلیوں کی ضرورت ہے اُن کے متعلق حقائق سے آگاہی حاصل کرنے میں یہ کمیٹی کس حد تک کامیاب رہے گی اس کا انحصار اس کمیٹی کے کام کرنے کے طریقہ کار پر ہوگا۔

اگر یہ کمیٹی حقائق سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے ان افراد اور عناصر سے رابطہ قائم کرے گی جو ملکی معیشت میں جمود اور صنعتی ترقی کی رفتار سست ہونے کے ذمہ دار ہیں تو اس صورت میں وقت کے ضیاع کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا ------ ماضی کا تجربہ شاہد ہے کہ افسران پر مشتمل بیشتر کمیٹیاں اپنے فرسودہ طریقۂ کار کے تحت کام کرنے کی وجہ سے مقررہ وقت پر قابلِ عمل اور ٹھوس سفارشات پیش کرنے میں ناکام رہیں۔

کسی ملک کی معیشت کے ارتقار اور صنعتی ترقی کی رفتار کو تیز کرنے اور صنعتی سرگرمیوں میں اضافہ میں اس ملک کا بنکاری نظام اور بنکاروں کی کارکردگی بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی تیز تر ترقی کا راز وہاں کے جدید طرز پر قائم ہونے والے بنکاری نظام ہیں۔ نیز وہاں کے بنکار پاکستان کی طرح بنکاری کے علاوہ مختلف صنعتوں اور تجارتی شعبوں میں دلچسپی نہیں رکھتے۔

ملکی معیشت کے جمود اور صنعتی ترقی کی رفتار سست ہونے سے پیدا ہونے والے اقتصادی بحران کی اہمیت کو کوئی ذی شعور نظر انداز نہیں کر سکتا۔ نیز صدر پاکستان کا یہ اقدام انتہائی بر وقت ہے لیکن ماضی کے تجربے کی روشنی میں بعض خدشات کا ان سطروں میں اظہار کرنا انتہائی ضروری ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ کمیٹی کمروں میں بیٹھ کر سرکاری اعداد و شمار کی روشنی اور متعلقہ حضرات کی جانب سے پیش کئے جانے والے حقائق کو سامنے رکھ کر اپنی سفارشات مرتب کرے گی؟

کیا یہ کمیٹی ان بنکاروں کی تجاویز پر غور کرے گی جنہوں نے قانون شکنی کرتے ہوئے سرمایہ داروں کو ترغیب دی کہ وہ کروڑوں روپے ۷ر جون اور ۸ر جون ۱۹۷۱ء کی درمیانی شب کو ان کے پاس جمع کرا دیں تاکہ ۸ر جون ۱۹۷۱ء سے منسوخ ہونے والے پانچ سو اور ایک سو روپے کے کرنسی نوٹوں کو جائز قرار دے دیا جائے اور ان کے "چہیتے" گاہک متاثر نہ ہوں؟

کیا یہ کمیٹی ان لوگوں کے مشوروں پر چلے گی جنہوں نے چور بازاری، اسمگلنگ اور انکم ٹیکس بچانے کی مذموم حرکت کے ذریعے کروڑوں روپے خُرد بُرد کئے اور قوانین کے "سقم" سے فائدہ اٹھا کر اپنا اُلّو سیدھا کیا؟

کیا یہ کمیٹی ان لوگوں کے مشورہ پر چلے گی جن کو حکومت نے باوجود ان کی قانون شکنی کے ۴۲ ہزار روپیہ فی لاکھ روپوں پر کاٹ کر باقی رقم واپس کر دی۔ حالانکہ یہ لوگ ہمدردی کے مستحق نہ تھے۔ کیونکہ انہوں نے قومی دولت ناجائز ذرائع سے حاصل کر کے اس کی ذخیرہ اندوزی کر کے ملکی معیشت کو نقصان پہنچایا تھا؟

کیا یہ کمیٹی ان بڑے بڑے زمینداروں، جاگیرداروں اور وڈیروں کی تجاویز پر غور کرے گی کہ جنہوں نے کوآپریٹو بنکوں سے کروڑوں روپے کے قرضے حاصل کئے۔ اپنی اور اپنی سیاسی و دیگر حیثیت سے فائدہ اٹھا کر زرعی شعبے کی ترقی کے لئے قائم کئے جانے والے امداد باہمی کے بنکوں کو دیمک کی طرح چاٹ گئے۔ رہے وہ لوگ ہیں جنہوں نے امداد باہمی کے بنکوں کے عہدیدار ہونے کی حیثیت سے کروڑوں روپے کے بے نامی قرضے جاری کر دیئے۔ جس کے نتیجے میں درجنوں بنک دیوالیئے ہو گئے۔ اور غریب ڈپازیٹرز، یتیم بچے، بیوا خواتین، ٹرسٹ اور سرکاری اور نیم سرکاری ادارے کروڑوں روپوں سے محروم ہو گئے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ انہی لوگوں نے جن پر ایک

بھی کروڑوں روپے کے سرکاری واجبات ہیں سو روپے اور پانچ سو روپے کے نوٹوں کی منسوخی کے وقت ۸ تا ۱۰ جون ۱۹۷۱ء کے دوران اپنے دوستوں اور دوسروں کے کروڑوں روپے کے کرنسی نوٹ اپنے اور اپنے خاندان کے نام سے جمع کرائے تاکہ زرعی آمدنی پر ملنے والی سرکاری چھوٹ کا فائدہ اٹھایا جا سکے اور اس طرح بھی ملک کو لوٹا جا سکے؟

کیا یہ کمیٹی ان بنکاروں کی سفارشات پر غور کرے گی جو حقیقی برآمد کنندگان کے لئے حکومت کی طرف سے مقررہ برآمدی چھوٹ خود کھا جاتے ہیں؟

کیا یہ کمیٹی ان بنکاروں کے مشوروں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی سفارشات مرتب کرے گی جو غلط ذرائع سے کمائی جانے والی دولت BLACK MONEY کو مختلف ناموں پر فکسڈ ڈپازٹ میں رکھ کر اس کے بدلے میں صنعت کاروں کو بڑے بڑے قرضے اور OVER DRAFT کی سہولتیں دیتے ہیں؟

کیا یہ کمیٹی ان بنکاروں پر بھروسہ کرے گی، جنہوں نے ڈپازٹر کے اعتماد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انشورنس، کاٹن ٹیکسٹائلز، جوٹ ٹیکسٹائلز، شوگر، کیمیکلز، تعمیرات، بناسپتی گھی، فروٹ فارمز و دیگر بیسیوں صنعتیں قائم کر لی ہیں۔ یہ وہ بنکار ہیں جو عوام کے روپے کو اپنی صنعتوں میں لگا کر دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے ہیں؟

کیا یہ کمیٹی اس بات کو معلوم کرنے کی کوشش کرے گی کہ ہمارے بنکار حقیقی برآمد کنندگان کو کتنے فی صد قرضے دیتے ہیں۔ ان کی راہ میں کون کون سی رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں؟

کیا یہ کمیٹی یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گی کہ صنعتی شعبے اور زرعی شعبے سے وابستہ افراد جو ملکی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کے مصداق ہیں کن کن مسائل سے دوچار ہیں؟

کیا یہ کمیٹی اس طرف توجہ دے گی کہ کاشتکاروں اور صنعتی شعبے کے لئے اسٹیٹ بنک سے خصوصی سہولتیں اور قرضے حاصل کرنے والے بنک کار کاشتکاروں اور صنعت کاروں کی کس طرح مدد کرتے ہیں۔ بنک سے حاصل کئے جانیوالے قرضے کا کتنے فی صد اپنوں کے لئے مخصوص ہوتا ہے اور کتنا غیروں کو دیا جاتا ہے؟

کیا یہ کمیٹی یہ جاننے کی کوشش کرے گی کہ درآمدات اور برآمدات اور خاص طور سے پٹ سن روئی، پٹ سن اور روئی کی مصنوعات، مچھلیاں اون، ریشم، چمڑے، کروم ماربل چائے وغیرہ کی برآمد کنندگان کو کیا کیا سہولتیں دی جاتی ہیں؟

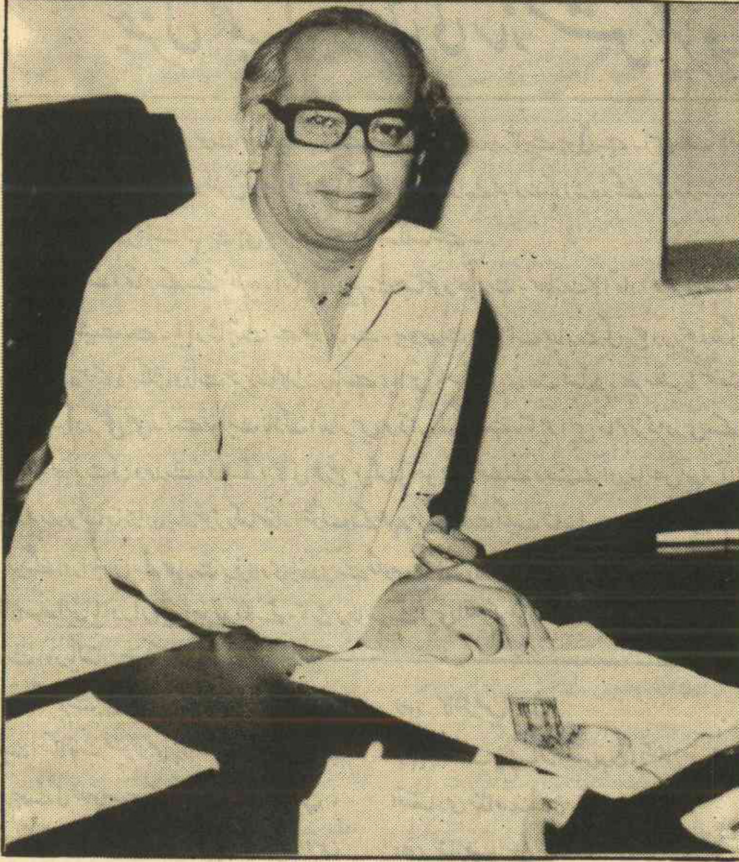
کیا یہ کمیٹی یہ جاننے کی کوشش کرے گی کہ ہمارے مختلف تجارتی بنک کے ڈائریکٹر صاحبان کتنی صنعتوں سے وابستہ ہیں۔ نیز ان کی کون کونسی تجارتی دلچسپیاں ہیں۔ یہ ڈائریکٹر صاحبان کتنے صنعتی اور تجارتی اداروں سے براہ راست اور بالواسطہ منسلک ہیں اور ان اداروں کو ان بنکوں کی طرف سے کون کون سی "خصوصی مراعات" حاصل ہیں؟

صدر پاکستان کی تشکیل کردہ کمیٹی جب تک ان سب اسباب کی چھان بین نہیں کرے گی، نہ ہی اس کمیٹی کے قائم ہونے کا مقصد پورا ہوگا اور نہ ہی ملکی معیشت میں جمود اور صنعتی ترقی کی سست رفتاری کی حقیقی وجوہ منظر عام پر آئیں گی۔

انتہائی خفیہ

پاکستان کی تباہی کے لیے نہرو کا بین الاقوامی پلان

پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کا ایک خفیہ اور غیر مطبوعہ مضمون



ایک ممتاز سیاسی رہنما کی

خفیہ فائل چوری ہوگئی

"الفتح" کی اس چوری کا تذکرہ بہت چلا۔ مسلم لیگ اور جماعت اسلامی اس سے بہت خوفزدہ تھیں حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہ تھی اُن کے جو خفیہ عزائم ہیں ہم اُن سے قارئین کو باخبر کرتے ہی رہتے ہیں۔ یہ خفیہ فائل مسٹر بھٹو کی اس وقت کی ہے جب وہ وزیر خارجہ تھے۔ ۱۹۶۴ء میں سٹیٹ بنک نے اس کی پانچسو کاپیاں تیار کی تھیں تاکہ اپنے مختلف سفارتخانوں اور متعلقہ شعبوں میں دی جاسکیں۔ یہ فائل ہم نے پارٹی کے سنٹرل سکرٹریٹ سے چرائی ہے جناب ذوالفقار علی بھٹو کو بھی اس کی خبر نہیں ہے اس سے بھارت کے پاکستان کے بارے میں بنیادی عزائم کا علم ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ مسٹر بھٹو نے مسٹر نہرو کا کس محنت سے مطالعہ کیا ہے اور ان مشاہدات کو قلم بند بھی کیا اور اپنی اور اُن کی صورتِ حال کے درمیان موازنہ اور مماثلت کی کوشش بھی کی ہے۔

جنرل تھمیہ کی برطرفی کی سازش نہرو نے تیار کی تھی

جواہر لال نہرو کی موت بھارت کے لئے ایک مہلک صدمہ ثابت ہوتی ہے۔ اس ملک کا مقدر اور مستقبل۔ اب مرکز گریز قوتوں کے رحم وکرم پر ہے۔ مردہ نہرو کی یاد کب تک اس کے ہم وطنوں کو بھانت بھانت کی بولیوں والے بھارت کو زندہ رکھنے کے جذبے سے سرشار رکھے گی۔ بھارت جو مبہم متصادم تضادات کی وسیع اور پر اسرار زمین ہے اور ایک نہایت ہی مہین رشتے میں منسلک ہے۔

بھارت کے اتحاد کے لئے خطرہ۔ اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود بھارت۔ بھارت کا اتحاد، دھرتی سے اور اس کے فطری ناطوں سے پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ اس وحدت نے بالا بالا۔ برہمنیت سے۔ یا بادشاہت سے جنم لیا ہے۔ یہ وحدت ابھی تک بھارت کی پیچ در پیچ زندگی کی مختلف تہوں سے مکمل طور پر نہیں گزری ہے۔ وحدت کے تصور کے سامنے جھکاؤ۔ اکثر اوقات غیر رضا کارانہ رہا ہے، یا اس کا حصول مخالف تسلط یا پھر مضبوط شخصیتوں کی قوت کے بل بوتے پر ہوا ہے۔ اس لئے بھارت کی وحدت حقیقی بھی ہے اور سطحی بھی۔ اسے نہایت نازک انداز میں برقرار رکھا گیا ہے۔ تاہم اپنی تمام تر کمزوری کے باوجود۔ یہ ابھی تک قائم ہے۔ بنیادی تضادات اور مستقل خطرات کے باوجود۔ بھارت کی وحدت دریائے گنگا کی طرح بل کھاتی ہوئی۔ دھندلے دھندلے اور خالص بھارتی انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔

قدیم ہند کو گپتا خاندان نے جوڑ رکھا تھا۔ اشوک کے عہد میں بھارت ایک شاندار وحدت سے گزرا۔ اس کی موت کے ساتھ، ملک ٹوٹنا شروع ہو گیا۔ اس کے بعد مغل داخل ہو گئے اور انہوں نے بھارت پر فولادی بازوؤں سے حکومت کی۔ بالآخران پر جب زوال آیا تو بھارت میں بے شمار شگاف پڑ گئے۔ ان ٹوٹی ہوئی کرچیوں کو ایک بار پھر انگریزوں نے اٹھایا اور ان میں پیوند لگائے۔ تاج برطانیہ نے اپنی اقلیم کو ہمالیہ سے راس کماری تک پھیلا دیا۔ اور جب برطانیہ نے اپنی بساط سمیٹی تو یہ برصغیر۔ حتمی طور پر بھارت اور پاکستان میں تقسیم ہو گیا۔

اس تقسیم سے بھی بھارت کے تضادات دور نہ ہو سکے تمام گہرے اختلافات تقسیم کو بھی برداشت کر گئے۔ بھارت میں تقسیم ہونے کی خصوصیت، آپس میں متصادم مذاہب، اس کی علاقائیت، اس کے مختلف لہجے اور زبانیں، اس کا فرسودہ ذات پات کا نظام اور اس کے توہمات۔ آزاد بھارت کی وحدت کے لئے مستقل خطرہ بنے رہے۔ گاندھی کی روحانی اور تقدس مآب شخصیت۔ بھارت کے افق کے ساتھ ساتھ ابھری کہ وہ انتشار کے زخم کا علاج کر سکے۔ لیکن اس سے پیشتر کہ وہ اپنا یہ عظیم مشن شروع کرتا، وہ ایک قاتل کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ گاندھی نے بھارت کے دیرینہ امراض اپنے جانشین نہرو کے لئے ترکے میں چھوڑے

نہرو کے لئے سب سے مشکل اور ہمت طلب مرحلہ بھی۔ بھارت کی وحدت کو قائم رکھنے کا ڈھونگ رچانا تھا۔ سترہ برس تک انہوں نے مہلک اختلافات کی بیخ کنی اور آزاد بھارت کی بنیادیں پختہ کرنے کے لئے دوڑ دھوپ کی نہرو بھارت کی وحدت کا تانا بانا تیار کرنے والے سب سے زیادہ نمایاں پارچہ باف تھے۔

جدید بھارت کی وحدت کے معمار کی حیثیت سے نہرو کو ان تمام خطرات کا احساس تھا جن سے انہیں دوچار ہونا تھا۔ یونان کے قدیم معماروں کی طرح، انہیں وحدت کا دیو پیکر مجسمہ ان گنت ستونوں پر تعمیر کرنا تھا۔ اس عمارت کے زیادہ اہم ستونوں میں یہ بھی شامل تھے۔

(۱) نہرو کی اپنی شخصیت

(۲) لادینی جمہوریت

(۳) کانگریس پارٹی

(۴) مختلف پانچسالہ منصوبوں کی شکل میں سماجی اور اقتصادی مقاصد۔

(۵) خارجہ پالیسی

پنڈت جواہر لال نہرو کی سحر انگیز شخصیت بھارت کے عوام کو بہالے گئی۔ انہوں نے بڑے بڑے اجتماعوں پر بے خود کر دینے کا مظاہرہ کیا۔ وہ انہیں سننے کے لئے لاکھوں کی تعداد میں کھنچے چلے آتے۔ نہرو بھارتی جنتا کے لئے افیون کی طرح تھے۔ انہوں نے جنتا کو مخمور کیا کہ وہ مکمل طور پر مطیع ہو گئے۔ بھارتی عوام ان گنت سادہ لوح دیہاتی، اور بے نام شہری باشندے نہرو سے پرستش کی حد تک محبت کرتے تھے۔ وہ ہجوموں کو مسحور کرتے، پھر ان کی عقیدت سے اپنی قوت اخذ کرتے۔

نہرو نے بھارتی عوام کو اپنی آواز پر جمع کرنے کے لئے کئی پلیٹ فارم استعمال کئے۔ ایک انقلابی کی حیثیت سے اپنے آغاز سے ہی اور اپنی ہنگامہ ساز زندگی کے آخر تک انہوں نے بھارت کے طول وعرض میں دور دراز دیہات تک سفر کیا۔ اور عوام الناس کو اپنے فلسفے اور اپنے طرز زندگی میں ڈھالنے کے لئے زور خطابت دکھایا۔ عام آدمی کو نہرو پر اعتماد تھا۔ اسی اعتماد سے نہرو نے اپنا ایک عظیم رہنما اور نجات دہندہ کی حیثیت سے تصور استوار کیا۔ یہ اعتماد اس حد تک جا پہنچا تھا کہ وہ ان سے سفید کو سیاہ منوا سکتے تھے۔

نہرو نوجوانوں کا آئیڈیل تھے، بھارت کے نوجوان نے نہرو میں اپنے عہد کا تحرک دیکھا۔ دانشوروں کے نزدیک وہ ایسے بے نظیر بہادر تھے جس نے بھارت کی آزادی جیتنے کے لئے بے شمار صعوبتیں برداشت کیں۔ قدامت پسندوں کو نہرو ماضی اور حال کے درمیان، روایت اور انقلاب کے درمیان ایک انمٹ رشتہ محسوس ہوتا تھا۔ غیر ملکی اس سے مسحور ہو جاتے تھے۔ ان میں سے بہت اسے مشرق ومغرب کے درمیان ایک پل سمجھتے تھے۔ ہارورڈ اور کیمبرج کے پس منظر کے باعث نہرو نفیس ترین مغربی ذہنوں کے ساتھ ایک تازہ ربط استوار کرنے کی اہلیت بھی رکھتے تھے۔ اور نہرو چونکہ مغربی طرز کو خیرباد کہہ کر گاندھی کے قدموں میں جا بیٹھے انہوں نے ایشیا کی خوشبو سے اپنے ذہن کو اس حد تک ضرور مہکا لیا کہ وہ غیر ملکیوں کے دلوں کو رام کر سکتے تھے۔

بہت سے عقیدوں، اور ذہنوں کے لوگ،

پاکستان کا معاملہ نہ ہوتا تو نہرو دولتِ مشترکہ سے علیحدگی اختیار کر لیتے

الفتح کراچی

بھارتی جنرلوں نے نہرو سے انتقام لینے کے لئے چین سے جنگ چھیڑی تھی

بوڑھے، جوان، اکھڑ دیہاتی، شہروں کے مہذب باشندے، ہندو اور مسلمان، پارسی اور عیسائی جس نقطے پر آملتے تھے، اس کا نام نہرو تھا۔

نہرو کو اپنی اس حیثیت کی طاقت کا بخوبی علم تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کی طویل تاریخ میں بہت کم لوگوں نے اپنی طاقت کو یوں مکمل طور پر استعمال کیا، جیسے جواہر لال نہرو نے کیا - نہرو نے اپنے زیادہ تر انتہائی مشکل۔ داخلی اور خارجی مسائل کو خاموش اور بے زبان عوام سے اپیل کر کے حل کر لیا۔ نہرو نے اپنا تسلط بلا شرکت غیرے جمانے کے لئے اپنی مطلق طاقت کا کسی حد کے بغیر استعمال کیا۔

پیدائشی طور پر نہرو ایک اونچے گھر کے ہندو تھے لیکن اپنے الہ آباد کے گھر میں اس نوجوان برہمن کو اپنے باقی خاندان کی طرح مسلم تہذیب و تمدن کے مقناطیسی اثر سے واسطہ پڑا۔ ان کے نقطۂ نظر میں لادینیت آنے کا سبب بھی یہی مسلم اثرات تھے۔ نہرو نے مسلم فلسفے تاریخ اور اسلام بطورِ مذہب کو مجموعی طور پر کبھی پسند نہیں کیا۔ نہرو کو اسلام کے جس حصے نے متاثر کیا وہ اسلام کی انقلابی روح تھی اور نہ اس کی نشاۃِ ثانیہ واقعہ یہ ہے کہ نہرو کو اسلام کی قوت سے بے حد نفرت تھی انہیں اس میں پاکستان کے جراثیم نظر آتے تھے۔ کیونکہ یہ اسلام کی متحرک خصوصیات ہی تھیں، جنہوں نے برصغیر کے مسلمانوں میں قیامِ پاکستان کے لئے بہادرانہ جدوجہد کا جذبہ پیدا کیا۔ نہرو اس کے برعکس مسلم تہذیب کی ان قریب المرگ روایات سے متاثر ہوئے جو یوپی کی ڈوبتی ہوئی ثقافت میں نظر آتی تھیں۔ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ اپنی ہم آہنگی۔ مسلم تہذیب کے مسکین اور عاجزانہ عناصر سے پائی یہ وہی عناصر تھے، جنہوں نے بھارت کے بعض مسلمانوں کو ہندوؤں کا تسلط ماننے پر بھی مجبور کر دیا تھا۔

پیدائش، ماحول اور تعلیم نے نہرو کو سوچ اور عمل دونوں میں لادین بنا دیا۔ لادینیت سے نہرو کے لگاؤ کی طاقت یا کمزوری۔ جو کچھ بھی ہو، وہ پیہم متصادم ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک واحد اتصال پذیر ربط تھے۔ تندخو ذات - پرست ہندو انہیں مشکوک نظروں سے دیکھتے لیکن کسی تلخی کے بغیر۔ بھارت کے بعض مسلمان بھی ان پر اعتماد کرتے تھے، لیکن مکمل بھروسہ نہیں، پنڈت نہرو نے ہندو۔ مسلم مسئلے کو یوں طے کر لیا کہ ہندو مفادات کو۔ بھارتی مفادات سے ہم آہنگ کر دیا۔ نہرو کے نزدیک ان دونوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ دونوں مترادف تھے - اس طرح انہوں نے اکثریت کی مرضی کے جمہوری اصول کے نام پر مسلم مفادات کو کچل دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا رویہ اختیار کر کے نہرو فرقہ واریت کی اپنی اندرونی خواہش کو انتہائی موثر اور سلجھے ہوئے انداز سے دھوکہ دے رہے تھے۔

نہرو۔ ایک ہمہ پہلو شخصیت رکھتے تھے، وہ اعلیٰ ذوق کے متمدن شخص تھے، اور فنونِ لطیفہ سے معقول لگاؤ بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے تھیٹر کے احیاء کی حوصلہ افزائی کی اور ہم عصر فنون اور ادب کی سرپرستی کی۔ ایک وسعت پذیر تمدن کے ذریعے انہوں نے بھارت کی وحدت کو حاصل کرنا چاہا۔ یہ خراج بھی انہیں پیش کیا جانا چاہیئے کہ امور مملکت میں انتہائی مصروفیت کے باوجود انہوں نے فنونِ لطیفہ کے فروغ کے لئے خاصا وقت وقف کیا اور شہریوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا کیا جو لادینی

نہرو ایک عرصہ تک کرشنا مینن کی شخصیت کے اسیر رہے

نقطۂ نظر پھیلانے کے مشن میں مصروف ہو گئے۔

پنڈت نہرو۔ اپنے تمام تر مصنوعی انکسار کے ساتھ ایک خود پسند انسان تھے۔ انہیں بہت ہی کم لوگ اپنے ہم پلہ نظر آتے تھے۔ افراد سے ان کے تعلقات حقیقت پسندانہ بھی تھے۔ اور معنوی بھی۔ ان کی کچھ وجہ یہ بھی ہے کہ وہ بھی ان کی طرح بعض نفسیاتی الجھنوں کا شکار تھے۔ ان پر جو مسلم تمدن کا اثر تھا، وہ انہیں رفیع احمد قدوائی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے قریب لے آیا وہ ان دونوں کی قدر بھی کرتے تھے اور پسند بھی آتے تھے۔ وہ تحریک آزادی کے دنوں میں ان کے بہت قریبی رفیق تھے اور آزادی کے بعد کے تمام مصائب میں بھی نہرو نے ان کا ساتھ دیا۔ نہرو نے با اثر ولبھ بھائی پٹیل کے ساتھ ہمیشہ کچھ احتیاط سے معاملہ رکھا۔ پٹیل کی طاقت کو جانتے ہوئے نہرو نے کبھی اس سے جھگڑا مول نہیں لیا۔ انہوں نے پٹیل کے اثر کو گھٹانے میں کامیابی اس طرح حاصل کی کہ حریت پسند قوتوں کو پوری آزادی دی کہ وہ اس گجراتی لیڈر کو ایک مجسم رجعت پسند کے نام سے پکاریں۔ ٹنڈن (پرشوتم داس ٹنڈن۔ کانگریس کے سابق صدر) کے معاملے میں نہرو نے قدیم طریقے اختیار نہیں کئے - بلکہ اس سے براہ راست تصادم لیا۔ درحقیقت۔ ٹنڈن کو ہمیشہ ہمیشہ کی خاطر نکالنے کے لئے نہرو نے خود بحران پیدا کیا۔ اس طرح انہوں نے کانگریس کو ایک نظم و ضبط کا احساس بھی دیا، جس نے بھارت کو متحد رکھا۔

پنڈت نہرو کا کرشنا مینن سے تعلق خصوصی ذکر کا محتاج ہے۔ کئی برس تک نہرو کرشنا مینن کی شخصیت کے اسیر رہے۔ کرشنا مینن نے محض اپنی ذہانت کے زور پر پنڈت نہرو کی سوچ کو قابو کئے رکھا۔ دونوں شخصیتوں کی دلچسپیاں اور نکتہ نظر کئی معاملوں میں مشترک تھا۔ دونوں دانشور تھے، اور آزاد خیال مکتبِ فکر میں پرورش پائی تھی، وہ بورژوا قدروں سے نفرت اور سوشلسٹ ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ دونوں نے کشمیر کو واہمہ بنا دیا۔ دونوں پاکستان سے نفرت کرتے تھے۔ کرشنا مینن۔ بھارتی کابینہ کا واحد رکن تھا جسے عالمی امور پر گرفت حاصل تھی، واحد رکن جسے نہرو ہمسری کی بنیاد پر گفتگو کر سکتا تھا۔ یہ مضبوط رشتے تھے۔ جنہیں کرشنا مینن نے پوری طرح استعمال کیا۔ کرشنا مینن سے مسٹر نہرو کے روابط کی بنیاد رومانیت میں نظر آتی ہے۔ مینن کے بھارت میں کوئی رشتے نہ تھے۔ مینن نے زندگی کا بیشتر حصہ برطانیہ میں گذارا، وہ بھارت میں بغیر کسی گہرے تعلق کے لوٹا۔ کرشنا مینن بھارت کی کسی بھی زبان میں بات نہیں کرتا تھا، اور اس کا ذہن عوام سے بہت دور تھا۔ نہرو کی طویل سرپرستی کے باعث کرشنا مینن نے عوام میں مقبولیت حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی کانگریس پارٹی کی اعلیٰ سطح کرشنا مینن سے حسد کرنے

سالنامہ

کشمیر کو ہڑپ کرنے کے لئے نہرو نے "سیکولرازم" کا ڈھونگ رچایا

گی اور اسے الگ تھلگ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن نہرو نے اس کا ساتھ دیا اور اس کی حمایت کی لیکن جب بین الاقوامی واقعات اور مسلح تصادم کا سامنا کرنا پڑا تو نہرو نے بے دلی سے کرشنا مینن سے اپنا دھیان اٹھالیا۔ اور اسے رخصت کر دیا۔ لیکن مینن کے بھارتی کابینہ سے نکل جانے پر بھی اس نے نہرو پر اپنا خاصا اگرچہ کمزور اثر ڈالے رکھا۔

پنڈت نہرو کے افراد سے تعلقات کے ضمن میں، ان کے سول سروس اور مسلح افواج سے تعلقات کا مشاہدہ بھی ضروری ہے۔ پنڈت نہرو مسلح افواج کے علاوہ ہر جگہ اتحاد کی طاقت کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ فوج سے ان کے تعلقات ہمیشہ کچھ نہ کچھ غیر فطری اور ناگوار رہنے رہا۔ نہرو کی شخصیت ویسے بڑی من موہنی تھی لیکن فوج کی موجودگی میں ان کا چہرہ تن جاتا اور رویہ سخت ہو جاتا۔ انہوں نے جان بوجھ کر اپنی فوج کو ان گنت قوموں پر مشتمل رکھا، اور انہیں بہت دور رکھا۔

اپنے وزیر دفاع مسٹر کرشنا مینن اور اپنے کمانڈر انچیف جنرل کو بندر اتھیمیہ کے جھگڑے میں انہوں نے اس جھگڑے کو صلح جو انداز میں حل کرنے کی بجائے جنرل کو سزا دینا ضروری خیال کیا۔ انہوں نے کمانڈر انچیف کی ذلت آمیز رخصت کے اسباب پیدا کئے، اور پھر اس جھگڑے سے اپنے مفادات کی تکمیل کی۔ اسطرح اپنے زعم میں انہوں نے شہری حکام کی بالادستی ثابت کرنے کی کوشش کی، اور یہ بتاکر کہ بھارت کی تقدیر ان کے نرم اور شریف ہاتھوں میں ہے۔ عملی طور پر یہ ظاہر کیا کہ انہیں ملک پر مکمل گرفت حاصل ہے۔

۱۹۶۲ء کے بھارت، چین تنازعے میں انہیں مسلح افواج کے خلاف اپنے تعصب کی بھاری قیمت چکانی پڑی۔ اپنی تمام نفاست کے باوجود وہ اسقدر غصے والے تھے کہ اپنی پسند یا ناپسند کو چھپا نہیں سکتے تھے۔ وہ چوٹ بھی لگا سکتے تھے، اور دل کو موہ بھی سکتے تھے۔ انہوں نے اپنی مسلح افواج کو بری طرح چوٹ لگائی اور پھر بڑے پیار سے اس کی قیمت ادا کی۔ فوجی طاقت میں انکے عدم اعتماد نے بھارت کو جھکنے پر مجبور کر دیا۔ نہرو تمام ذہانت اور صلاحیتوں کے باوجود۔ مسلح افواج کے کردار کو سمجھنے میں غلط رہے۔ انہیں نظر انداز کر کے وہ اپنے ملک کو تباہی کے کنارے لے آئے، ایسی صورتِ حال میں جہاں بھارت اب بھی اپنے زخم سہلا رہا ہے۔ ڈپلومیسی پر کاملاً اور دفاع پر ناکافی بھروسہ کرتے ہوئے، نہرو نے اپنی تباہی کو دعوت دی اور ملک کو ایک مہیب خطرے سے دوچار کر دیا۔ واضح طور پر "عظیم" نہرو اپنے ملک کا دفاع کرنے میں ناکام رہا۔ اور ایک قائد کی بنیادی ذمہ داری کو نبھانے میں میں پورا نہ اتر سکا۔ تاریخ کو نہرو کے تصور سے یہ داغ دھونے میں مشکل ضرور پیش آئے گی۔

اب ذرا موازنہ کرتے ہوئے دیکھیں تو احساس ہوتا ہے کہ نہرو کی مضبوط بنیادوں والی سول سروس کے ساتھ ہم آہنگی زیادہ حقیقت پسندانہ تھی۔ انڈین سول سروس اور مستقل سروس کے دوسرے ڈھانچے تمام برطانوی ساخت کے تربیت یافتہ تھے۔ عوامی زندگی کی طرف ان کا رویہ، متکبرانہ اور الگ تھلگ رہنے کا تھا۔ وہ اپنی مادرار حقیقتوں کے تصورات میں کھوئے رہتے تھے۔ اپنے طبقے کا تصور رکھنے والے بیوروکریٹس کے اس کلب نے اپنے چارٹر کی بنیاد اس اس یقین پر رکھی کہ برطانوی راج ان کی ذہانت اور اہلیت کی بنا پر قائم رہا تھا۔ آزادی کے موقع پر سول سروس اور خاص طور پر آئی سی ایس کو یقین تھا کہ وہ اپنے گندمی "صاحبوں" کو اپنے گورے آقاؤں کی نسبت زیادہ مضبوطی سے قابو میں رکھ سکیں گے۔ بھارت کی آزادی حاصل ہوتے ہی، ان کی اقتدار کی بھوک فوری طور پر۔ بری طرح چمک اٹھی۔ نہرو کے پہلے مثبت اقدامات میں سے اس طاقتور طبقے کو زمین پر واپس لانا تھا۔ وہ ان کے کسی فریب کے شکار نہ ہوئے، ان کی شان و شوکت، کرکٹ کے گیند کی نسبت کچھ زیادہ تیزی سے ہی ختم ہو گئی۔ مسلح افواج کو سیاست سے الگ رکھنے کے اصول پر نہرو نے اس کو بھی کسی شک و شبہ کے بغیر واضح کر دیا کہ وہ سول سروس کی طرف سے بھارت کی سیاسی زندگی میں کوئی مداخلت برداشت نہیں کرے گا۔ نہرو نے سول سروس کے بڑے بڑے ستونوں پر سیزر کے انداز میں ایسی گرفت کی کہ انہوں نے جلد ہی اپنی روایتوں اور ذہنیت کو تبدیل کر لیا۔ نہرو نے ان کا جائزہ لیا اور پھر انہیں ان کی حیثیت کا احساس دلایا۔ اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ سول سروس نے اپنی توقعات اور خواہشات کا گلا گھونٹ دیا۔ اور ان کو اپنی حقیقی ذمہ داریاں کے دائرے میں محدود کر لیا یہ سخت رویہ اختیار کرنے کے باعث نہرو نے عوامی زندگی کا وقار پیدا کیا اور جمہوریت کے آثار پھیلائے۔ سول سروس کی طرف نہرو کا رویہ اتنا ہی کامیاب رہا جتنا کہ مسلح افواج کی طرف ان کا رویہ ناکام رہا۔

نہرو نے لادینی جمہوریت کا ناقوس بہت زور سے بجایا۔ لیکن بھارتی ذہن میں یہ عقیدہ پیدا کرنے کی جان توڑ کوششوں کے باوجود، لادینی جمہوریت کو ہمیشہ خطرات درپیش رہے۔ طرز زندگی کے اعتبار سے اس روش کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی کہ یہ بھارت کی سیاست کا تسلیم شدہ حصہ بن سکتی۔ اس کا مستقبل بہت مخدوش ہے۔ بھارت کی دھرتی کے طبعی طور پر متصادم ہونے کے باعث لادینیت بھارت کی نئی زندگی کی بہار میں پھول بن کر نہیں کھل سکی۔ لادینیت اور جمہوریت دونوں بھارت کے لئے اجنبی ہیں۔ ذات پات اور الگ تھلگ رہنے والے ہندو تمدن کے کٹر طبقے سے ان کی ہم آہنگی نہیں ہو سکتی نہرو نے ان نظریات کے لئے ڈھال کا تاثر اپنی زندگی سے دیا۔ لیکن ان سے ان کا اپنا لگاؤ بھی قطعی طور پر نظر باقی نہیں تھا۔ یہ کہنا کوئی کج فکری نہ ہوگا کہ اس کی لادینیت کا سبب اس کا کشمیر کے بارے میں رویہ تھا، نہرو نے کشمیر پر بھارت کے سفاکانہ تسلط کو برقرار رکھنے کے لئے لادینیت کا زور و شور سے پرچار کیا۔

نہرو۔ جمہوری اصولوں کے دلدادہ تھے، انہوں نے آزاد بھارت کو ایک جدید آئین، اور قابلِ عمل سیاسی ادارے دیئے۔ گاندھی نے آزادی کے بعد کانگریس پارٹی کو توڑ دینے کی ہدایت کی تھی، لیکن اس پر عمل کرنے کے برعکس نہرو نے بھارت کے طول و عرض میں کانگریس کو مضبوط طور پر منظم کیا۔ نہرو نے دانشوروں کو تنقید کی ترغیب دی، پریس کو آزادیٔ تحریر دی اور شہزادوں اور سیاست دانوں کو سازشوں کی آزادی دی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنے

نہرو نے شہزادوں اور سیاست دانوں کو سازشوں کی آزادی دی

مفلوک الحال کروڑوں ہم وطنوں کو تین مرتبہ ووٹ ڈالنے کا موقع دیا۔ جمہوریت کی تاریخ میں یہ الیکشن یادگار ہیں۔ یہ ویسے چھوٹے کارنامے نہیں ہیں تاہم اپنی تحریکِ آزادی کے دوران، خود تنقیدی کے موڈ میں نہرو نے اپنے عوام کو خبردار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ بھارت طبعی طور پر کھلی جمہوریت کے قابل نہیں تھا۔ اور جب موقع ملا کر وہ تباہ کر دے، یا تعمیر کر دے، تو نہرو نے بھارت کو جمہوریت کی ایک موثر طرز دی، اگرچہ اس کا تانا بانا مضبوط نہ کر سکا۔ انہوں نے کانگریس پارٹی اور بھارتی قوم پر اپنے ذاتی وقار سے حکمرانی کی۔ وہ کسی حقیقی اور موثر اپوزیشن کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اور بہت کم لوگوں کو اپنا ہمسر خیال کرتا تھا۔ جب وہ حکومت میں تھا، تو وہ ڈکٹیٹر زیادہ اور جمہوریت پسند کم تھا۔ لیکن اس نے جمہوریت کے سوانگ کو قابلِ تعریف مہارت سے رچائے رکھا۔ وگرنہ وہ کشمیر کو یوں تسلط میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ سکھوں کے علیحدہ صوبے کے عوامی مطالبے کو اس بے دردی سے نہیں دبا سکتا تھا۔ ناگاؤں کی حق خود ارادیت کی جدوجہد کو کچل نہیں سکتا تھا، اور عوام کی منتخب کردہ صوبائی حکومتوں کو ختم نہیں کر سکتا تھا۔ یہ نہرو کے غیر جمہوری اقدامات میں سے چند ایک ہیں۔ فہرست تکلیف دہ حد تک طویل ہے۔ یہ حقیقت کہ لادینی جمہوریت کا مستقبل سخت خطرے میں ہے، ظاہر کر سکتی ہے کہ نہرو کے دور میں بھارت میں اس کو روبہ عمل لانا کتنا سطحی تھا۔ اگر نہرو کی ہدایت میں بھارتی عوام لادینیت کو قبول کر لیتے تو پندرہ برس میں پانچ سو سے زیادہ بار مسلم اقلیت کا خون نہ بہایا گیا ہوتا۔ اس کی موت سے کچھ عرصہ پہلے ہی بھارت نے فرقہ وارانہ فسادات کی تاریخ کا خوفناک قتلِ عام دیکھا۔ نہرو کے لادین بھارت میں ہی راشٹریہ سیوک سنگھ اور جن سنگھ نے بھارت کی سیاسی زندگی میں اپنے بھدے سر اٹھائے فرقہ واریت پر یقینی طور پر نہرو کی اپنی کانگریس پارٹی کے اہم لیڈروں نے بھی عمل کیا۔

نہرو بلاشبہ، لادینیت اور جمہوریت کی طرف راغب تھے، لیکن یہ لگاؤ، کچھ زیادہ مبالغے کے ساتھ بیان کیا گیا، یہ نظریاتی اور عقیداتی لگاؤ ہونے کی بجائے، بنیادی طور پر ایک سیاسی حربہ تھا۔ جب اس کے موازنے کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ نہرو کا لادینی جمہوریت کا ستون کمزور بنیادوں پر کھڑا کیا گیا تھا۔

جیسا کہ پہلے مختصراً ذکر کیا گیا ہے بھارت کی وحدت کا ایک بڑا ستون کانگریس پارٹی تھا، نہرو ایک بلند معیار کا مجاہدِ آزادی تھا۔ وہ نجات کی جدوجہد میں بھارت میں واپسی کے فوراً بعد ہی کود پڑا تھا۔ اس جدوجہد کی قیادت ان دنوں انڈین نیشنل کانگریس کے ہاتھوں میں تھی۔ نہرو اس تحریک میں ایسے جذبے کے ساتھ شامل ہوئے، جو اور کسی میں نہ تھا۔ لاکھوں بھارتی کانگریس کے اس بڑے قافلے کا حصہ بن گئے جس کی سالار اندرا گاندھی کی بیمار شخصیت تھی۔ نہرو کی جوانی، تیز ذہانت اور متمدن اطوار نے کانگریس اور تحریکِ آزادی کو رنگ اور جان بخشی، نہرو اپنے دل میں آزادی کا شعلہ ادائل سے ہی لیے چل رہے تھے۔ اس شعلے کی چنگاری آخری دم تک ان کے ساتھ رہی، آزادی کی جدوجہد کے دوران سارا عرصہ نہرو بہت تیز رہے بے شمار نشیب و فراز اور ناکامیوں سے ان کے قدم متزلزل نہیں ہوئے۔ جنگ کو جاری رکھنے کے لئے نہرو کے عزم نے اپنے ہم وطنوں کو قربانی کی اعلےٰ ترین بلندیوں پر پہنچا دیا۔ ۴۰ برس سے زیادہ عرصے تک نہرو نے کانگریس پارٹی کی ہر جوش لگاؤ سے خدمت کی وہ کانگریس کو بھارت کے بلند ترین مقاصد کے کامیاب وسیلہ بنانے والے چند بانیوں میں سے تھے آزادی کی دھن میں کانگریس نے بھارت کو متحد کیا۔ جدوجہد آزادی کی علامت کے طور پر اس امر نے آزادی کے بعد اتحاد کو مضبوط کیا۔ جب چند برس بعد آزادی کی جنگ جیت لی گئی تو کانگریس نے اپنی عظمت کا بیشتر حصہ بھی کھو دیا۔ یہ غلط راستوں پر چل پڑی، لیکن نہرو نے اس تنظیم سے اپنا اعتماد پھر بھی نہ ختم کیا۔ وہ اپنی تمام تر قوت کے ساتھ اس کی خدمت میں مصروف رہے اور اس کی کئی بیش ہا افتادہ پالیسیوں کو محو بھی کیا۔ اکثر اوقات نہرو کو شاباشیوں کے ذریعے کانگریس کو اوپر کھینچنا پڑتا۔ اور اس کی قائدانہ صلاحیت بحال کرنی پڑتی۔ کانگریس بھارتی پارٹیوں کی ماں تھی۔ نہرو نے بھارت کی سیاسی زندگی میں اور پارٹیوں کو بھی پھلنے پھولنے کا موقع دیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ یہ اس کے لئے کوئی خطرہ نہیں بن رہی ہیں۔ وہ اپنی حیثیت کو مستحکم بنانے کے لئے انہیں وجود دیتے رہے۔ بجائے اس کے کہ وہ ان میں سے بعض کو اپنی تنظیم میں ہڑپ کر لیتے، انہوں نے ان کے علیحدہ رہنے کو ہی ترجیح دی۔ بعض اوقات وہ اختلافی نظریات کے پراپیگنڈے کی بھی حوصلہ افزائی کر دیتے، صرف اس لئے کہ وہ جو پالیسی نافذ نہیں کرنا چاہتے، ان کے لئے اپنی نااہلی ظاہر کر سکیں۔ وہ پالیسیاں جو ان پر داخلی یا خارجی دباؤ کے تحت ٹھونسی جاتی تھیں۔ انہوں نے اس ترکیب سے اپنا کام کئی بار نکالا جب پنڈت نہرو نے یہ تھیوری پیش کی کہ کشمیر کے مسئلے کے حل کا مطلب ہوگا۔ بھارت کے پانچ کروڑ مسلمانوں کی تباہی۔ اس کے ساتھ ساتھ نہرو نے متعصب ہندو تنظیموں اور ان کے لیڈروں کو یہ اجازت بھی دے دی کہ وہ اپنے مقاصد کے لئے راستہ ہموار کرتے رہیں جہاں ان کے مقاصد اور نہرو کے کشمیر سے وابستہ دیرپا مفادات بھی ہم آہنگ ہو جائیں۔ اس کے خدشات قابلِ یقین ظاہر نہ ہوتے اگر ان کے ساتھ نامعلوم لوگوں کی طرف سے تشدد کے واقعات حتیٰ کہ نہرو نے کانگریس کے اندر بھی مختلف گروہوں کو آپس میں متصادم ہونے دیا۔ جب اسے ضرورت ہوتی کہ اس کی پالیسیاں دائیں بازو کی طرف جھکیں، تو وہ صنعتکاروں اور صاحب وسیلہ افراد کی حوصلہ افزائی کرنے لگتا، جب وہ بائیں بازو کی طرف جھکنا ضروری خیال کرتا تو وہ ترقی پسندوں اور بائیں بازو والوں کو آگے لے آتا۔ اس طرح اس نے حتمی اختیارات کی عنان سنبھالنے کی کوشش کی۔

اتحاد کا ایک کم ڈرامائی اور زیادہ دیرپا عنصر نہرو کی اقتصادی پالیسی تھا۔ بھارت کے وزیرِ اعظم کی حیثیت سے نہرو پلاننگ کمیشن کا سربراہ بھی تھا اور اپنے ملک کو اس نے تین پانچسالہ منصوبے بھی دیئے، نہرو نے ایک قدیم طرزِ معیشت کو جدید ترقی پسندانہ مملکت میں تبدیل کرنے کے لئے بڑی سخت محنت کی۔

نہرو کی اقتصادی پالیسیاں۔ فلاحی مملکت کے تصور پر مبنی تھیں۔ جذباتی طور پر وہ سوشلسٹ تھا۔ لیکن اس کے دور میں سرمایہ داری پروان چڑھی۔ نہرو ایک شاطر سیاستدان کی حیثیت سے سیاست کو اسقدر اچھی طرح جانتا تھا کہ اس نے اس میں سے معیشت کی

حسبِ ضرورت کبھی صنعت کاروں اور کبھی انقلابیوں کی حوصلہ افزائی

اہمیت کم کر دی۔ اس کی سیاسی فکر سوشلسٹ فلسفوں سے نزدیک تھی اور اسی قرب نے نہرو میں سوشلسٹ اقدار کی سوسائٹی پر مبنی ایک مبہم اور رومانی طرزِ زندگی کا تصور پیدا کیا۔ وہ چونکہ اقتصادیات کا عالم نہیں تھا۔ اس لئے اس نے اپنے "ماہرین" کو اجازت دی کہ وہ اس کے احساسات کی اس طرح رہنمائی کریں کہ بھارت کو پرائیویٹ اور پبلک سیکٹر کے غیر عقلی امتزاج پر مبنی ایک جزوی طور پر الجھا ہوا اقتصادی نظام دیا جائے۔

اگرچہ نہرو۔ غربت کی موجودگی سے بہت پریشان تھے، لیکن انہوں نے اس کے مقابلے کے لئے سست اور صبر والا راستہ اختیار کیا۔ سمجھوتوں اور دلائل کا راستہ۔ دوسرے اسباب کے علاوہ ان وجوہات کی بنا پر اپنی مکمل گرفت کے ۱۷ برس میں نہرو بھارت کی بیل گاڑی کے دور کی معیشت میں انقلاب لانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ لیکن اس بات کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ ان تمام ظاہری مجبوری کے باوجود بھارت کی معیشت کچھ نہ کچھ آگے ضرور بڑھی۔ ایک منظم مزدور قوت ابھری، ملک بھر میں نئے کارخانوں کا ظہور ہوا، فولاد اور کوئلہ کی پیداوار میں کافی اضافہ ہوا۔ بھاری اور درمیانی صنعتوں نے عام پیداوار میں اپنا حصّہ ادا کرنا شروع کیا، گھریلو صنعتیں بھی چمکیں، دیہات تک بجلی اور مواصلات کے ذرائع پہنچ گئے۔ آب پاشی کے لئے بند اور نہریں بھی بنائی گئیں۔ ایک اقتصادی ابھار تھا جس نے ملک کو قریب تر کر دیا۔ نہرو نے ملک کو پیوند لگانے کے لئے اقتصادیات کی مضبوط کشش استعمال کی۔ اس نے صوبوں کو ایک دوسرے کے سہارے کا محتاج بنانے کی شعوری کوششیں کیں۔ اس کے اقتصادی منصوبے، اس طرح سوچے گئے تھے کہ ہر ایک کو اب بھٹی میں ڈالا جا سکتا تھا۔ مرکب یونٹوں میں اقتصادی خود مختاری کے فروغ کے لئے کوئی کوشش نہ کی گئی بلکہ، صوبائی خود کفالت کو ہر قدم پر کچلا گیا۔ اور صوبوں کی آپس میں محتاجی کی ہر طرف سے حوصلہ افزائی کی گئی۔

خارجی امور پنڈت نہرو کا قلعہ تھے۔ اسمیں انہوں نے خطرناک مہارت حاصل کر لی۔ خارجہ پالیسی بنانے والے مدبّر کی حیثیت سے وہ جدّت کا متلاشی، جارح اور باریک بیں تھا اس نے اپنی خارجہ پالیسی کی بنیادیں عقلی اور اخلاقی اساس پر کھڑی کرنے کا دعویٰ کیا حقیقت میں اگر سائنسی نقطۂ نظر سے اس کا جائزہ لیا جائے۔ نہرو کی خارجہ پالیسی بھی اس کی اندرونی پالیسی کیطرح خیر و شر سے ماوراء تھیں۔ اس نے یہاں بھی اپنی تضاداتی خوبیوں کو اسی بے تکلفانہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی جس طرح اس نے اندرونی معاملات میں کیا تھا۔ اس نے آگ اور پانی کو ایک جگہ کرنے کی کوشش کی، اس کے نتیجے میں وہ ایک ایسی حیثیت کو پہنچا کہ وہ بالکل بے نقاب ہو گیا۔

نہرو نے بھارت کو اوپر تو بہت بلند کیا، لیکن نیچے سے بالکل کھوکھلا کر دیا۔ یہ سچ ہے کہ اس نے اپنے ملک کو جمہوری ادارے دیئے لیکن اس نے رہے سہے ذات پات کے نظام اور فرقہ وارانہ تصادم کا ایک خوفناک ترکہ چھوڑا۔ بین الاقوامی طور پر اس نے بھارت کو غیر جانبداری کا چولا پہنایا۔ مغرب اور مشرق کے درمیان دلاّلی کا کردار ادا کرنے والے کی حیثیت سے۔ لیکن بالآخر نتیجے میں اس نے بھارت کو بے یار و مددگار "تنہا" چھوڑ دیا، ہمسائے اس پر بھروسہ نہیں کرتے، اور اب وہ افریقہ اور ایشیا کے پیشِ نظر میں ایک دیو سے معمولی حیثیت پر آ گیا ہے۔ نہرو کی خارجہ پالیسی کو دو نمایاں حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصّہ سنہری دور تھا جو ۱۰ برس سے زیادہ عرصے تک موجود رہا ۱۹۴۶ء سے جب نئی دہلی میں ایشین کانفرنس منعقد ہوئی، اس وقت سے لے کر ۱۹۶۰ء کے کچھ برس بعد تک۔ یہ برس عظیم کامیابیوں کے تھے، جس کے دوران ایشیا اور افریقہ کی نئی قوموں کو ایک صف میں لانے کے لئے نہرو نے غیر جانبداری کے نظریے کی سرپرستی کی۔ نہرو نے غیر جانبداری کو ایک وقار اور عالمی اپیل بخشی۔ شروع شروع میں آزادی کے کچھ عرصے بعد تک نہرو نے عوام اور قوموں کو غیر جانبداری کی طرف موڑنے میں خاصی دقتیں محسوس کیں۔ لیکن بعد میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، اور ایشیا اور افریقہ میں زیادہ سے زیادہ خود مختار ملکوں کے نقشہ پر ابھرنے سے، اور ایٹمی طاقتوں کے باہمی تباہی کے خوف سے آپس میں متصادم نہ ہو سکنے اور کمیونزم کی دنیا میں گہری شیرازہ بندی کے باعث غیر جانب داری کی رنگا رنگ اقدار ظاہری طور پر نمایاں ہو گئیں۔

یہ دور جب اقوام متحدہ میں بڑی طاقتیں۔ چھوٹی قوموں کا دل جیتنے کے لئے کوشش کرتی ہیں۔ نہرو نے ڈپلومیسی کی ممکنہ قوّت کو گرفت میں لینے میں تیزی دکھائی۔ اس نے انتہائی محنت سے اسے بھارت اور اپنے عزائم کے لئے دفاعی لائن کے طور پر استعمال کیا پنڈت نہرو نے اپنی خارجہ پالیسی کو استعمال کیا، بھارت کو متحد کرنے کے لئے اور اپنے ہم وطنوں کو وقار اور عزت نفس دینے کے لئے۔ باہر بھارت کی ساکھ بین الاقوامی طور پر بڑھی، قومی فخر کا احساس بھارت بھر میں پھیل گیا۔ ایشیا اور افریقہ کی دنیا میں پھر اس نے ایک تیز رفتار تحریک چلائی۔ بندونگ یا بلغراد کہیں بھی۔ نہرو راستے کی نشاندہی کرتے اور ایشیا اور افریقہ اس کے پیچھے چل پڑتے، مشرق و مغرب ادب سے سنتے۔ بندونگ میں آنجہانی نہرو نے پنچ شیلا کے ارتقا میں اپنا کردار ادا کیا۔ چین، انڈونیشیا، اور مصر کے اشتراک سے بھارت اور افریشیائی رہنماؤں کی اس تاریخی کانفرنس میں صف اوّل میں کھڑا تھا۔

اقوامِ متحدہ میں بھارت نے ترقی پذیر اور قوموں کی قیادت سنبھال لی۔ بھارت نے کئی نازک مباحثوں کو ایک رخ اور راستہ دیا۔ امن و جنگ کے مسئلوں میں نہرو کی حکومت کا کردار عام طور پر فیصلہ کن رہا۔ نہرو نے تخفیف اسلحہ کے مذاکرات میں ایک کردار ادا کیا۔ جنوب مشرقی ایشیا میں امن بحال کرنے اور کوریا کی صلح میں بھی اس کا کردار نمایاں تھا۔ نہرو نے کانگو میں امن کے لئے اقدامات میں حصّہ لیا اور اسی طرح سوئز میں کشمکشوں کی آگ کو سرد کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ تبّت کی صورت حال، ہنگری کی بغاوت میں بھی اس کا کردار خاصا موثر رہا۔ اقوام متحدہ بھارت کا سٹیج بن گیا، نہرو نے اپنے آپ کو ایک مرکزی شخصیت کے طور پر پیش کیا۔ تمام اہم بین الاقوامی کانفرنسوں اور ذمہ داریوں میں بھارت کے لئے یقیناً ایک مقام ہوتا تھا۔ بھارت کی حیثیت اتنی اہم تھی کہ کوئی بین الاقوامی اجتماع بھارت کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بھارت کی آواز عزت اور توجہ سے سنی جاتی تھی۔ نہرو کی زور دار وکالت نے بھارت کو عظمت کا ایک خصوصی احساس بخشا۔ ایک وقار

نہرو نے شعوری طور پر صوبوں کو ایک دوسرے کا محتاج رکھا

جو اس کی بنیادی حیثیت سے کہیں بڑھ کر تھا، بھارت کی حقیقی حیثیت سے متناسب نہ تھا۔ بھارت کی انا بہت بلند ہوگئی۔

عالمی تعلقات کے ایک دانشمند طالب علم کی حیثیت سے نہرو نے روس سے بھی سودبخش تعلقات استوار کئے۔ اس نے بھارت کو اس ملک کے نزدیک لانے کے لئے اس وقت سوچا جب اکثر قومیں کمیونسٹ ممالک کے ساتھ دور کے تعلق رکھنے میں خطرہ سمجھتی تھیں۔ پنڈت نہرو کو اس قسم کا کوئی اندیشہ لاحق نہ تھا۔ اس کے پاس تاریخ کا اتنا وافر علم ضرور تھا جس کی روشنی میں وہ ارتقا پذیر قوموں کے روزافزوں اثر کا پیش ازوقت اندازہ کر سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ انقلاب کے شعلے بھی بھڑک سکیں گے۔ اس لئے وہ بین الاقوامی اشتراکیت کے انقلابی عمیر سے دہشت زدہ نہیں تھا۔ اور نہ ہی اس کے تسخیر عالم کے مجاہدانہ نظریات سے اسے کوئی خطرہ تھا۔ دس برس سے زیادہ گذرے، مسٹر نہرو نے کہا تھا: "کمیونزم کا وقت گزرچکا"، یہ مشاہدہ اس وقت پیش کیا گیا جب کمیونزم کا اتحاد اور انقلابی قوت اپنے زوروں پر تھی۔ پنڈت نہرو کے روس سے تعلقات جبلّی مزاحمتوں سے ماورا تھے۔ بلکہ اس سے بھارت کو سودبخش مقام ملا اور مغرب ومشرق کے درمیان بھارت کو فیصلہ کن حیثیت مل گئی۔ وہ ایک ایسا مدبّر، اور پروہت بن گیا، جس کی بات مخالف قوتوں میں سنجیدگی سے سنی جاتی اور جس کے مشورے پر غور بھی کیا جاتا تھا۔ روس، مشرقی یورپ سے معقول اور حقیقت پسندانہ تعلقات قائم کرنے میں کامیابی حاصل کرکے پنڈت نہرو نے ہم عصر ڈپلومیسی کی دنیا میں سب سے اہم کردار ادا کیا۔

پنڈت نہرو کو تدبّر کی یہ سبقت بھی حاصل ہے کہ اس نے مختلف النسل اور مختلف البراعظمی اقوام کی دولتِ مشترکہ کے اچھے نتائج کو پیش ازوقت محسوس کیا۔ بھارت کو دولتِ مشترکہ میں رکھنے کے فیصلے پر نہرو کی مخالفت سے زیادہ تعریف کی جارہی ہے حالانکہ دولتِ مشترکہ میں بھارت کو رکھنے کا سب سے بڑا سبب اس ادارے میں پاکستان کی موجودگی ہے۔ دولتِ مشترکہ کے اندر رہ کر نہرو نے بھارت اور پاکستان کے تنازعات اور بالخصوص کشمیر کے تنازعے پر بات چیت کو غیر جانبدارانہ رخ دینے کی کوششیں کیں۔ اگر پاکستان کا معاملہ نہ ہوتا تو نہرو آزادی حاصل کرتے ہی دولتِ مشترکہ سے علیحدگی کا اعلان کر دیتا۔ اس ادارے کے لئے جھکاؤ اسے مجبوراً اپنے قومی اسباب کی بنا پر کرنا پڑا تھا۔

واقعات نے بھی مسٹر نہرو کی خفیہ طور پر مدد کی چین اور روس کا تصادم بھی اس سے بہتر وقت پر نہیں ہو سکتا تھا۔ روس اور مغرب کے درمیان کشمکش کا خاتمہ بھی مسٹر نہرو کے لئے نہایت ہی اچھے لمحے پر ہوا۔ اس پر خوشگوار مواقع کی بارش ہوگئی۔ بعض معاملوں میں اس نے بین الاقوامی حالات کا بری طرح غلط اندازہ لگایا۔ اس نے عوامی جمہوریہ چین سے مہلک ٹکرّلی اور پھر بھارتی فوج کی تباہ کن شکست اور بھارتی عوام کی مایوسی دیکھی۔ پاکستان کے خلاف اس کی مستقل معاندانہ پالیسی بھی اس طرح کی فاش غلطی تھی۔

جس طرح بھارت کی خارجہ پالیسیوں میں عقل اور تدبر کم تھا، اس لئے اسے اپنے کسی بھی ہمسایے سے اپنے اختلافات کم کرنا مشکل در مشکل ہوتا گیا۔ بھارت کے لئے رفتہ رفتہ یہ دشوار تر ہوتا گیا کہ وہ اپنے ہمسایوں کے ساتھ باہمی مفاہمت اور تعاون کی فضا میں بات چیت کر سکے۔ بھارت نے اپنے تنازعات کو خالص بھارتی شرطوں پر حل کرنے کی سوچی۔ اپنے ہمسایوں کے سلسلے میں اچھے تعلقات کی قدریں بھارت کی لغت سے محو ہوگئیں۔ بھارت نے اپنے آپ کو ایک ایسی بڑی طاقت سمجھا کہ جسے اس جنگی جنون میں مبتلا دنیا میں کوئی بہت بڑا فرض سونپا گیا اور جس میں ہمسایوں کے جائز مفادات کو بھی دبا دینا اور اپنے ساتھ رہنے والے پڑوسیوں کے ساتھ مسائل سلجھانے کے لئے بیٹھنا اس کے رتبے سے کمتر ہے۔

نہرو امن کا ذکر نہایت جذباتی انداز میں کرتے تھے، لیکن اپنے ملک اور ہمسایوں کے درمیان موجود تنازعات کے حل کے راستے میں خود کوہ ہمالیہ سے بھی بڑی رکاوٹ بنے رہے۔ اس نے پاکستان، چین اور سیلون سے اپنے اختلافات ختم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے برما سے سرحدی تنازعہ ختم کرنے کے لئے کوئی کوشش نہیں کی اس نے نیپال کے اندرونی معاملات میں غیر معمولی شرانگیزی کا مظاہرہ کیا انڈونیشیا اور بھارت کے درمیان نفرت کی دیوار کھینچ، یہ اکیلا آدمی ایشیا کے ایک ارب ۴۰ کروڑ انسانوں کے درمیان دوری کا ذمہ دار تھا۔

نہرو کا بنیادی موضوع پاکستان کے خلاف نفرت پھیلانا تھا۔ وہ اس نئی مملکت کا سب سے بدتر دشمن تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا مقصد پاکستان کو تنہا کرنا اور پاکستان کے مشکلات پیدا کرنا بنا لیا تھا۔ اپنی پیہم کوششوں سے اس نے اس ملک کا ایک مذہبی رجعت پسند ریاست کی حیثیت سے تصوّر نہیں کیا۔ اس کی اس انتہائی نفرت نے اس کے برعکس پاکستان کے موقف کو بے اندازہ تقویت پہنچائی۔ آزادی سے پہلے مسلم لیگ سے اس کے غیر مصالحانہ رویے کے باعث ہی، مسلمانوں کو اپنی صفیں منظّم کرنے اور کانگریس کے ہاتھوں سے پاکستان چھیننے کا موقع ملا۔ آزادی کے بعد نہرو کی پاکستان کو تنہا کرنے اور نقصان پہنچانے کی کوششوں کے جواب میں پاکستان کے عوام نے اپنے سیاسی اور اقتصادی مسائل پر قابو پانے کی روز و شب تگ و دو کی۔ پاکستان کے خلاف نہرو کی اقتصادی اور سیاسی جنگ ہی دراصل ابتدائی طور پاکستان کے سیاسی اور اقتصادی طور پر قابلِ عمل ہونے کی ذمہ دار ہے اس روّیے سے اس ملک کو بے پناہ طاقت اور مدافعت کا جذبہ ملا۔ اگر نہرو کشمیر کو ہڑپ نہ کرتے مغربی اور مشرقی پاکستان کے خلاف اپنی فوجیں صف آرا نہ کرتا، اقتصادی رکاوٹیں کھڑی نہ کرتا پاکستان کی زندگی یعنی دریاؤں کے راستے نہ روکتا، تو پاکستان کو آزادی کے بعد درپیش مسائل کے حل میں بڑی دقتیں پیش آتیں۔ اب اگر پاکستان کو سیاسی استحکام اور کسی حد تک اقتصادی توانائی ملی ہے تو یہ نہرو کے چیلنج کا جواب ہے۔ پاکستان نے نہایت جرأت سے مدافعت کی ہے اور جب کہ بھارت اپنے بین الاقوامی وقار کی بلندیوں پر تھا اس وقت پاکستان تن تنہا بھارت کی ہوسناکیوں کے فریب اور دوغلے پن کو بے نقاب کرنے کی ذمہ داری ادا کرتا تھا۔ برسوں تک پاکستان بھارت

کے ہمسایوں کا ڈنکرک بنارہا۔ اس نے تن تنہا بھارت کو اپنی ذات پات کی بوسیدہ اور فرسودہ تہذیب کو میکانگ سے ہندوکش تک بڑھنے سے روکا۔ پاکستان کو تباہ کرنے کی بجائے نہرو کے ردِ عمل میں پاکستانی عوام نے بے مثال اتحاد قائم کر لیا۔ اب نہرو کے تمام آفاقی دعوے بکھر گئے ہیں اور پاکستان کا وقار اور تصور دنیا بھر میں زیادہ درخشاں ہو رہا ہے۔ ایشیا اور افریقہ بین الاقوامی تعلقات میں پاکستان کے کردار کا اقدام کرنے لگے ہیں۔ اپنے تمام ہمسایوں سے پاکستان کے تعلقات انتہائی احترام اور اعتماد کے ہیں۔ پاکستان نے بھارت کے علاوہ اپنے تمام ہمسایوں سے اپنے تنازعات طے کر لئے ہیں۔

عوامی جمہوریہ چین سے مسلح تصادم میں الجھ کر غیر جانبداری کے مصنف نہرو نے جانبدار ممالک کے ساتھ بنیادی سمجھوتہ کیا اور اپنی موت کے وقت وہ بھارت کی خارجہ پالیسی کو انتہائی تذبذب میں چھوڑ کر گیا۔ اس نے اسے یتیمی کی حالت میں چھوڑا، جانبدار ہے اور نہ غیر جانبدار۔ اس نے اپنی عظیم مملکت کو کھلے بازار میں دونوں ہاتھوں میں گداگری کے کشکول لیے چھوڑا۔ تضادات کا معمار۔ جو مخالف عناصر کے بل بوتے پر آگے بڑھا، آخری مرتبہ نٹوں کا سا کرتب دکھا کر اپنے ملک کو ایک ناقابلِ تضاد میں الجھا گیا۔ آج نہرو کی خارجہ پالیسی اپنی عمیق ترین پستی میں ہے اور نہرو نے اپنے بسترِ مرگ سے اس کی سسکتی ہوئی شام کا نظارہ کیا تھا۔ چین سے مسلح تصادم میں الجھ کر اور پھر اس وسعت کو مبالغہ آمیزی دے کر نہرو نے اپنے ملک کو انتہائی مایوسی کے عالم میں چھوڑ دیا۔ اگر وہ اپنے حواس مجتمع رکھتا اور اوسان خطا نہ کرتا تو وہ اپنی دوستی، اور قوموں میں اسے عزت بخشنے والی پالیسی کو چھوڑے بغیر چین سے سرحدی تنازعہ طے کر سکتا تھا۔

اس طرح چین بھارت تصادم سے شروع ہونے والی بھارتی خارجہ پالیسی ذہنی انتشار کا شکار ہے۔ اور اعتماد و تدبر سے محروم ہے۔ یہ پہلے دور کا بالکل الٹ ہے برسوں تک نہرو نے بھارت کے عوام کے سامنے چند بندھے ٹکے اصولوں کا پرچار کیا۔ نوآبادیاتی نظام اور عالمی کشیدگی کی بنا پر مغربی ممالک کو مطعون کیا۔ لیکن جب ایسے واقعات پیش آئے، جن کا مقابلہ کرنے کی اس قیادت کو اہلیت نہ تھی تو بھارت کے عوام کو اچانک نئے اصولوں کی اچھائیاں بتائی گئیں۔ جو ان اصولوں سے قطعی مختلف تھے، جو اس سے پہلے بھارت کی عظمت کا راز بتائے گئے تھے۔ چین بھارت کا عظیم اور دوست ہمسایہ گذشتہ دس برس سے جس کے بھارت سے مشترکہ مفادات اور اتحاد کے دیرپا رشتے تھے، اسے اچانک بھارت کا سب سے بدتر دشمن بنا کر پیش کیا گیا۔ غیر جانبداری جو انسان پر مبنی عالمی امن کے لئے واحد جواب تھا۔ اس پر۔ انتہائی پریشان کن اور غیر مبہم نتائج کے باوجود سمجھوتہ کر لیا گیا۔ بھارت کی خارجہ پالیسی فلک بوس نظریاتیت سے گر کر تنگ نظر موقع پرستی کی پستیوں میں جا گری۔ تضادات نے ہر قدم پر ظاہر ہونا اور بھارت کو مایوسیوں کے دائرے میں سمیٹنا شروع کر دیا۔ ایک ایسی حقیقت جو بھارت جیسی

باقی صفحہ ۲۹ پر ملاحظہ فرمائیں

کتنے عیّاش لوگ ہیں ہم بھی

غزل

احمد ندیم قاسمی

ہم اندھیروں سے بچ کے چلتے ہیں
اور اندھیروں میں جا نکلتے ہیں

ایک کو دُوسرے کا ہوش نہیں
یوں تو ہم ساتھ ساتھ چلتے ہیں

وہ کڑا موڑ ہے ہیں درپیش
راستے ہر طرف نکلتے ہیں

ٹھوکریں کھا رہے ہیں صدیوں سے
گو دِلوں میں چراغ جلتے ہیں

کتنے عیّاش لوگ ہیں ہم بھی
دن میں سَو منزلیں بدلتے ہیں

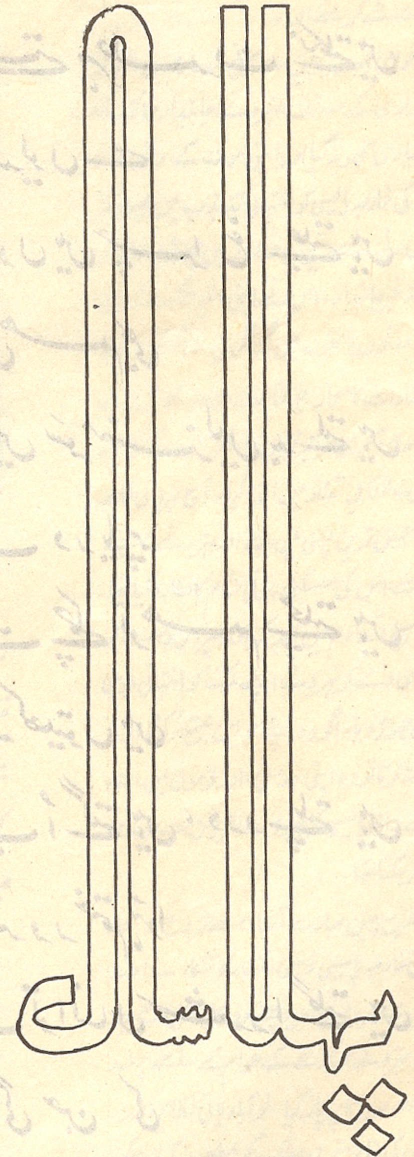
نام دھرتے ہیں آبِ دریا پر
ریت چمکے تو ہم مچلتے ہیں

وہ ہوئیں بارشیں، کہ کھیتوں میں
کرب اُگتے ہیں، درد پلتے ہیں

پتھروں کا غرور ختم ہُوا
اب تو انساں شرر اگلتے ہیں

اک جہنّم ہے زندگی جن کی
حسرتِ جنّت سے کب بہلتے ہیں

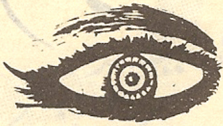




ایک پل کی سخت محنت بھی ہے ــ اِک کارِ محال
کیونکہ محنت کا لقب ہے ــ زینۂ اوجِ کمال
ایک پل، اِک پل نہیں، اِک ان گنت میعاد ہے
ایک پل میں ــــ سب بہارِ عالمِ ایجاد ہے
ایک دن، جو سینچا جاتا ہے ــ جگر کے خون سے
وہ زیادہ قیمتی ہے ــ دولتِ قارون سے
قصۂ فرہاد والا ــــ غلغلہ تو اور ہے
وہ خیالی ندرتوں کا ــــ بُلبلہ تو اور ہے
ہاں مگر ــ عشق میں ڈوبے ہُوئے، شیدائے فن
چند جیتے جاگتے، سچّے، حقیقی کوہکن
ایک پل، اِک دن نہیں، بلکہ برابر ایک سال
کر چکے ہیں جانفشانی ــ بہرِ تزئینِ جمال
ایک پُورا سال، اِک سالم اکائی عُمر کی
ایک چھوٹی سی، مگر روشن کمائی عُمر کی
کر چکے ہیں ــ ارتقائے نظمِ گیتی پر نثار
ہو اُجاگر ــ تاکہ تھوڑا سا تو ــــ مفہومِ بہار
یہ اکائی ــ پُورے مستقبل کی اِک تصویر ہے
اس کے ماتھے پر ــ بقائے آدمی، تحریر ہے

سید عبدالحمید عدم

فارغ بخاری



غزل

فارغ گھٹن جو اُس کی دو چند ہوگئی
موسم ذرا کھُلا تو ہُوا بند ہوگئی

ہوتا نہیں جنوں کبھی حالات کا اسیر
وحشت ہی کیا جو وقت کی پابند ہوگئی

پہلے تو ایک خشم مجسّم تھی وہ نگہ
صد شکر رفتہ رفتہ رضامند ہوگئی

گلشن پہ جو گری تھی جلانے کے واسطے
وہ برق خود ہی خاک کا پیوند ہوگئی

ایسی زباں پہ خاک بھروسہ کرے کوئی
جو زہر ہوگئی تو کبھی قند ہوگئی

کیونکر کوئی کہے گا اسے دُور بیں نگہ
اپنی ہی آنکھ میں جو نظر بند ہوگئی



مزدور

ضیاء سرحدی

تری تنویر کی نیرنگیوں سے جہانِ آب و گل کی جلوہ باری
یہ مخمل کی حسیں نازک مزاجی ترے دستِ حسیں کی دستکاری
ترے مرہونِ منت نغمہ و نَے فروزاں تجھ سے شغلِ بادہ خواری
یہ رقصِ دلربا صحنِ جہاں میں ترے ادراک کی افسوں شعاری
یہ کھیتوں کی جہاں پرور مُروت ترے اشکوں سے اس کی آبیاری
سنگھاسن یا رئیسوں کے محل ہوں ترے خوں کی ہے سب میں لالہ کاری

ازل سے آج تک سارے زمانے تری محنت پسندی کے خزانے
ترے انفاس کی گرمی سے قائم تمناؤں کے سارے کارخانے

تری محتاج ساری زندگانی! ترے دریوزہ گر سارے خداوند
مگر اس قوّتِ عظمیٰ کے باوصف تجھے دنیا نے رکھا ہے نظر بند
شبِ افلاس کی تاریکیوں میں
طلائی فکر کی زندیقیوں میں





خالد علیگ

پھر ہے نزولِ تیرہ شبی، روشنی کی خیر
اپنوں کی خیر بلکہ ہر اِک اجنبی کی خیر

پھر آدمی کے ہاتھ میں خنجر ہے، دوستو
اور میں یہ سوچتا ہوں کہ اب "آدمی" کی خیر

اِس حسنِ بندوبست کے قربان جائیے
دستِ تہی کی خیر، نہ تاجِ شہی کی خیر

یہ وقت زندگی پہ بڑا سخت وقت ہے
خود زندگی کے لب پہ ہے اب "زندگی کی خیر"

تشنہ لبوں نے صورتِ دریا تو دیکھ لی
دریا کی خیر، آپ کی "دریا دلی" کی خیر

مانگ اے طلوعِ صبحِ نجات و حیاتِ نو
اس ظلمتِ تمام میں دیدہ وری کی خیر

کس نامراد دَور میں جینا پڑا ہمیں
اب شاعری کی خیر نہ پیغمبری کی خیر

پتھر ہے "دستِ شیشہ گراں" کا نصیب آج
خالد یہ حال ہو تو بھلا کیا کسی کی خیر

منظوم افسانچے

محسن بھوپالی

شہرت

ہیروئن بننے کی خواہش دل میں لئے
شہرت کے زینے پر چڑھنے
تہمینہ گھر سے نکلی تھی

اِک دن بیوہ ماں نے دیکھا
اخباروں میں خبر چھپی تھی
پولس کے ایک چھاپے کی
اور فوٹو کے ایک کونے میں
تہمینہ بھی بیٹھی تھی!

گُر

بھیک مانگنے نکلی ہے تو بھیک کا گُر بھی سیکھ
کُھلے بال اور پھٹی آستینیں سے
کیا دلچسپی لوگوں کو
اگر گریباں کُھلا رہے
—— تو پیٹ بھرے!

O

کمرشل بیوی

"بڑے ساب" سے باقی باتیں طے کر لی ہیں
آج رات کو جمخانے میں
تم بھی اُن سے مِل لینا
اور ہاں —— رُخصت ہوتے وقت یہ کہنا
ٹھیکہ "بلیک اسٹار" کو دیں!

احمد رئیس

دِل کی کتاب

مجھ سے مانگو نہ میری عمرِ تمنّا کا حساب
یہ میرے دِل کی کتاب
اِس کے ہر باب میں رُوپوش ہیں یادوں کے سحاب
خوابوں کے گلاب
یہی مشعل، یہی قندیل، یہی ایک چراغ
یہی منزل ہے یہی دیار
میری تحریر، مرا عکس، مرا آئینہ
میری تحریر ہے میری تاریخ
مجھ سے پُوچھو نہ کوئی بات
نہ کوئی قصہ
مرا حصہ
مرا ورثہ
یہ میرے دِل کی کتاب
اس پہ پھیرو نہ سیاہی کی لکیر
اس کو چُومو یہ ہے میری تحریر

٭

ناصر زیدی

کھولو نہ دوستو لبِ اظہار چُپ رہو
گر چھن چُکی ہے جرأتِ گفتار چُپ رہو

کہتے ہیں وہ کہ اِذنِ تکلّم نہیں ابھی
کب تھم سکی ہے وقت کی رفتار چُپ رہو

سقراطِ وقت ہو تو پیو زہرِ خامشی
منصور ہو تو یوں نہ سرِ دار چُپ رہو

اس عہدِ کم سواد میں یوسف نہیں کوئی
سُونا پڑا ہے مصر کا بازار چُپ رہو

ناصر! بنامِ شیشہ گراں کس نے یہ کہا
سُن کر شکستِ جام کی جھنکار چُپ رہو

غزل

صفدر سلیمؔ سیال

یوں تجھے آج مری تشنہ دہانی مانگے
جس طرح خواب میں بچہ کوئی پانی مانگے

کوئی چہرہ کسی چہرے کا شناسا تو نہیں
دل تو پاگل ہے کہ مجھ سے ترا ثانی مانگے

میں نے منظوم تو کی تیرے بدن کی خوشبو
اور کیا مجھ سے تری مست جوانی مانگے

اُس کے خط، اس کی تصاویر بھی واپس کر دوں
نامہ بر اُس سے کہو اپنی زبانی مانگے

حشر برپا ہے مرے ذہن کے ہر گوشے میں
وہ پری وش ہے کہ پُر خواب کہانی مانگے

دل کی کس بات پہ میں کان دھروں صفدرؔ جی
دل تو ایسا ہے کہ ہر شام سہانی مانگے

اس طرح چونک پڑی ذکرِ وفا پر دنیا
جیسے صحرا میں کسی سے کوئی پانی مانگے

یوں طبیعت پہ گراں بارئ شب طاری ہے
جیسے سنگلاخ زمیں مصرعۂ ثانی مانگے

شب کی دہلیز پہ مبہوت ہے دن کا راجا
اور سورج سے اماں رات کی رانی مانگے

اتنا مشکوک ہے انساں کہ جہاں رات پڑے
میزباں پہلے شرافت کی نشانی مانگے

خطِ حالات پہ خاموش کھڑا ہوں کب سے
جانے کس وقت مجھے دنیائے فانی مانگے

اے حسین ابنِ علی غرفۂ دوراں سے نکل
صورتِ حال وہی رسم پرانی مانگے

اور کچھ دیر میں دھرتی پہ لہو برسے گا
یہ زمیں وقت سے خونابہ فشانی مانگے

جس نے تسخیر کیا وقت کے داؤدوں کو
تجھ سے وہ چیز ترے مُلک کا بانی مانگے

تو کہ مصروف ہے جذبوں کی شناسائی میں
اور غالبؔ کی زمیں گنجِ معانی مانگے

پھر بھڑک اُٹھے ہیں جذبات سرِ شام سلیمؔ
پھر طبیعت کسی دریا کی روانی مانگے

باز گشت

اس عنوان کے تحت
ہم آئندہ بھی پرانی
نگارشات کا
انتخاب پیش کریں گے

بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ مضمون

ہر ملنے والے شخص کو جھوٹا اور دغا باز سمجھو

شفا حکیم صاحب کے ہاتھوں ملی، نام ڈاکٹر کا ہُوا

ایسٹ انڈیا کمپنی کی داستان عجیب و غریب ہے۔ یہ انگریز قوم کے تدبّر، حکمتِ عملی، سازش مکر و فریب اور عیاری کی داستان ہے۔ کس طرح انگریز تاجر اس ملک میں آئے۔ کیونکر حکومت میں رسوخ حاصل کیا اور مغلیہ حکومت کے زوال پر کس طرح مختلف صوبوں کے فرمانرواؤں کو آپس میں لڑا کر اپنی بالادستی قائم کی اور ان سے معاہدے کر کے کس طرح اپنے لئے فوائد حاصل کئے۔ کس طرح اپنی رقیب یورپی کمپنیوں کو زک دے کر ملک سے بے دخل کر دیا۔ کس طرح ہندوستانیوں ہی کی فوج بنا کر ہندوستان پر اپنا تسلط جمایا۔ یہ سب حالات اور اس کی بدولت بعد میں جو عظیم الشان انگریزی سلطنت قائم ہوئی اس کے سچے سچے صحیح صحیح واقعات بغیر لاگ لپٹ کے سلیقے سے بیان کئے جائیں تو داستانِ الف لیلہ کے افسانوں سے کچھ کم دلچسپ اور عبرت آموز نہ ہوگی۔

انگریز مدبّرین نے اپنی ہندوستانی حکومت کے استحکام کے لئے جہاں اور بہت سی تدبیریں کی تھیں وہاں ایک تدبیر انڈین سول سروس یعنی آئی۔ سی۔ ایس بھی تھی۔ یہ سروس حکومت کی جان تھی۔ اس کی تربیت گاہ انگلستان میں تھی۔ یہاں انگریز نوجوانوں کو ایسی تعلیم و تربیت دی جاتی تھی کہ وہ حکومت کے مختلف شعبوں میں کام انجام دینے کے اہل ہوسکیں۔ اس میں مقابلے کا امتحان ہوتا تھا اور جو لوگ اس امتحان میں کامیاب ہوتے انہیں ہندوستان بھیج دیا جاتا۔ اور یہاں ان کی اہلیت کی مناسبت سے مختلف عہدوں پر ان کا تقرر کر دیا جاتا۔ اس سروس کی بہت تعریف کی جاتی تھی اور بڑے فخر سے یہ بیان کیا جاتا تھا کہ دنیا میں اس کا جواب نہیں۔ اس سروس کے اشخاص کی مستعدی، کارگزاری، جفاکشی، پیچیدہ مسائل سلجھانے اور نازک مواقع پر ان کی قوتِ فیصلہ کو بارہا سراہا گیا۔ حکومت کی سیکرٹریٹ اس کا پاور ہاؤس تھا۔ یہ سب کچھ صحیح لیکن اس سروس کے قیام کا اصل منشا یہ تھا کہ حکومت کے استحکام اور انگریزی وقار اور رعب کو قائم رکھا جائے۔

اس سروس سے متعلق لوگوں کو اہلِ ملک سے ہمدردی نہ تھی۔ حکومت ہندوستانیوں کے فائدے کے لئے نہ تھی۔ اس کے قیام کا مقصد برطانیہ کا مفاد تھا۔ اس ملک کی اسی قدر خدمت کی جاتی تھی جس قدر دُودھیل گائے کی کی جاتی ہے کہ ضروری دیکھ بھال کرتے ہیں۔ وقت پر چارہ ڈال دیتے ہیں۔ لٹی کر کے سانی بناتے اور کھلاتے ہیں۔ کبھی کبھی چرنے کے لئے چراگاہ بھیج دیتے ہیں۔ دودھ دوہتے وقت دودھ کا ایک حصہ بچھڑے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ باقی سارا دودھ مالک کا ہوتا ہے۔ ہندوستان سے برطانیہ کا وہی تعلق تھا جو گائے کا اس کے مالک سے ہوتا ہے۔ اس سروس والوں کو ہندوستان میں رہنے، کام کرنے اور اہلِ ملک سے برتاؤ کرنے کے متعلق خاص ہدایات دی جاتی تھیں ایک ہدایت بہت ہی عجیب و غریب تھی۔ وہ یہ تھی

”پورٹ سعید عبور کرنے کے بعد جو شخص بھی تم سے ملے تو سمجھ لو کہ وہ بد دیانت، جھوٹا اور دغا باز ہے“ ہندوستانیوں کی سیرت و اخلاق کے متعلق اہلِ حکومت کا یہ خیال کسی خاص مصلحت پر مبنی ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سروس کے اکثر ارکان اہلِ ملک سے دور دور رہتے تھے۔

مسلمان بھی یہاں فاتح کی حیثیت سے آئے تھے مگر وہ بہت جلد ملک والوں میں گھل مل گئے۔ انگریز اپنا دامن بچا کر صاف نکل گیا۔ البتہ ایک جماعت جو اینگلو انڈین کہلاتی ہے جس کے ارکان تجارت یا ملازمت وغیرہ کے سلسلے میں ایک مدت تک ہندوستان میں رہے یہاں کے حالات اور ماحول سے متاثر ضرور ہوئے مگر ان کی تعداد اور ان کا اثر کچھ زیادہ قابلِ لحاظ نہ تھا۔

انگریز سویلین افسر ہماری زبان، ہماری تہذیب ادب و اخلاق، رسم و رواج، ہمارے لباس اور کھانوں کو بڑی حقارت سے دیکھتے تھے اور ہر بات میں اپنی فوقیت جتاتے تھے۔ ہمارے بزرگ بھی ان کی تہذیب، لباس اور طور طریقوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اور ان کی ہنسی اڑاتے تھے۔ خاص طور پر ان کے طہارت کے طریقے سے سخت نفرت کرتے تھے۔ یہ لوگ ہماری زبان سے بھی ناآشنا تھے۔ برائے نام کچھ بول سیکھ لیتے تھے جو خانساماؤں اور بیروں سے کام لیتے وقت استعمال کئے جاتے تھے۔ انہوں نے ”پانی لاؤ“، ”میز لگاؤ“، ”ڈپٹی صاحب کو سلام بولو“، ”تم کیا مانگتا“ جیسے جملے رٹ لئے تھے۔ یہ سچ ہے کہ ہماری زبان کوئی ایسی زبان نہ تھی کہ وہ اسے سیکھنے کی کوشش کرتے لیکن حاکم محکومانہ تعلقات میں زبان دلجوئی کا کام دیتی ہے۔

جب ہم کسی دوسری زبان کو سیکھتے ہیں تو ہمیں اس زبان والوں سے قدرتی طور پر انس ہو جاتا ہے۔ جو انگریز ہماری زبان سیکھ لیتے اور ہم سے ہماری زبان میں بات چیت کرتے تو ہمارے دلوں میں ان کی جانب کشش سی پائی جاتی اور ہم انہیں اپنا ایک گونہ ہمدرد خیال

آئی۔سی۔ایس جس نے سی۔ایس پی کو جنم دیا

کرنے لگتے تھے۔ یہ انگریز سویلین اس گُر سے بے خبر تھے اور بے خبر کیا انہیں اس کی پروا ہی نہ تھی کہ ہمارے دلوں میں انگریز کا احترام یا مہر والفت ہو۔ اس کے لئے یہ کافی تھا کہ ہم اس سے اور اس کی حکومت سے مرعوب رہیں اور اسے اپنا مائی باپ سمجھیں۔

یورپ کی قوموں میں انگریز سب سے زیادہ کم آمیز ہے۔ علاوہ اس فطری کم آمیزی کے وہ محکوم قوم سے میل جول ناپسند کرتا تھا۔ خود حکومت بھی نہیں چاہتی تھی کہ اس کے عہدیدار ہندوستانیوں سے زیادہ خلا ملا رکھیں ان کے خیال میں ان کے اس برتاؤ سے انگریز قوم اور انگریز حکومت کا وقار اور رعب کم ہو جاتا ہے۔ حکومت نے ان میں غرور پیدا کر دیا تھا جو فاتح کی شان ہے۔ وہ ہمیں ایک کمتر درجے کا انسان سمجھتا تھا اور ہماری تہذیب اور آداب واخلاق، رسوم اور ہمارے علوم کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس کی تربیت کچھ ایسی ہوئی تھی کہ اس کے خیال میں یہ بات آ ہی نہ سکتی تھی کہ ہم بھی مہذب و متمدن ہیں اور ہماری زبان میں بھی ایسے علوم و فنون ہیں یا ہم میں ایسے ذی علم اصحاب موجود ہیں جو قابلِ قدر اور لائقِ عزت ہیں۔

مولانا حالی اپنے زمانے کا ایک واقعہ بیان کرتے تھے کہ ایک روز دلی کے کمشنر کو پیچش ہو گئی۔ انگریز سول سرجن ان کا معالج تھا لیکن اس کے علاج سے کچھ فائدہ نہ ہوا اور روز بروز ان کی حالت ردّی ہوتی جاتی تھی۔ ان کا ایک ہندوستانی پیشکار تھا جسے صاحب کے مزاج میں کچھ رسوخ حاصل تھا۔ وہ ایک روز صاحب سے ملا اور بڑی ہمدردی سے کہا: "سول سرجن کے علاج سے آپ کے مرض میں کچھ افاقہ نہیں ہوا۔ آپ کی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے۔ پیچش ایسا خطرناک مرض نہیں جیسا آپ لوگ خیال کرتے ہیں۔ ہمارے حکیم معمولی دواؤں سے مریض کو اچھا کر دیتے ہیں۔ آپ فرمائیں تو حکیم صاحب سے آپ کے لئے دوا لاؤں۔ آپ چند ہی روز میں اچھے ہو جائیں گے۔" کمشنر صاحب نے کہا: "پیشکار صاحب ایسی بات زبان سے نہ نکالئے۔ اگر صاحب لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ ہم نے دیسی حکیم کی دوا استعمال کی ہے تو صاحب لوگ ہم سے ملنا جلنا ترک کر دیں گے۔ کلب سے ہمارا نام خارج کر دیں گے اور سرکار ہمیں خدمت سے برطرف کر دے گی۔"

پیشکار نے بڑے ادب سے کہا: "کیا آپ کو ملازمت جان سے زیادہ عزیز ہے۔" یہ بات پیشکار نے ایسے ہمدردانہ اور محبت آمیز لہجے میں کہی کہ صاحب کے دل میں اُتر گئی۔ ایک لمحہ سوچنے کے بعد کہا: "اچھا تو آپ ایک کام کیجئے۔ شب کو دس بجے کے بعد جب سب سو جائیں تو آپ ہمارے غسل خانے کے دروازے سے داخل ہو کر ہمارے لئے دوا لے آیا کریں۔ لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔" غرض پیشکار صاحب چوروں کی طرح غسل خانے کا دروازہ کھول کر اندر آتے اور صاحب کو دوا پلا جاتے۔ چند ہی روز میں صاحب اچھے ہو گئے۔ نام ڈاکٹر کا ہوا اور اس کے علاج کی بہت تعریف ہوئی۔

انگریز عام طور پر سلام کا جواب انگلی کے اشارے سے دیتا تھا۔ اس کو ہدایت تھی کہ سلام کے وقت کم از کم ۴۵ ڈگری (درجے) کا زاویہ بننا ضروری ہے۔ شہر کے شرفاء، زمیندار اور رئیس جو صاحب سے ملتے وہ اپنی گاڑی بنگلے کے احاطے سے باہر ہی چھوڑ دیتے تھے۔ بنگلے کے اندر لانے کی اجازت نہ تھی — پہلے خانساماں کی خدمت میں حاضر ہوتے اور خیر و عافیت پوچھتے اور یہ معلوم کرتے کہ صاحب کا مزاج کیسا ہے۔ کہیں خفا اور برہم تو نہیں۔ وہ کہتا غسل خانے میں ہیں یا بہت مصروف ہیں۔ ابھی گول کمرے میں نہیں آتے۔ وہ ناچار اسے خوش کرنے کی باتیں کرتے اور چپکے سے اس کی مٹھی بھی گرم کر دیتے۔ اس طرح صاحب تک رسائی ہو جاتی۔ خانساماں معمولی آدمی نہ تھا۔ اسے بھی اپنی حیثیت کا اندازہ تھا۔ صاحب اس پر بہت اعتماد کرتے تھے اور بہت سی باتیں اور ملنے والوں کے حالات اسی کے ذریعے معلوم کرتے تھے کہ وقت پر وہ ایک آدھ لفظ ان کے حق میں کہہ دے۔

خواجہ حسن نظامی مرحوم نے مسلمانوں کو جو مشورہ دیا تھا کہ وہ خانساماں گری سیکھیں تو وہ اسی بنا پر تھا۔ خواجہ صاحب دلی کے چیف کمشنر، انگریز سیکرٹریوں اور انگریز افسروں سے ملتے رہتے تھے۔ ان ملاقاتوں سے انہیں انگریزوں سے کام نکالنے کے گُر معلوم ہو گئے تھے۔ اس لئے مسلمانوں کو یہ مشورہ انہوں نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی دیا ہو گا۔ خانساماں کے ذریعے بہت سے کام نکل آتے تھے۔ شمالی ہند میں خانساماں اکثر مسلمان ہی ہوتے تھے وہ صاف ستھرے رہتے اور اپنی حیثیت اور خودداری کو قائم رکھتے۔ وہ صاحب کے وفادار بھی ہوتے تھے۔

رڑکی میں ایک انگریز نوجوان انجینئری کی تعلیم پاتا

تھا۔ دفعتاً ان کے والد یا سرپرست کا انتقال ہو گیا۔ اور تعلیم جاری رکھنے کا کوئی سہارا نہ رہا۔ مایوس ہو کر تعلیم ترک کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ خانساماں کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے کہا: "آپ دل برداشتہ نہ ہوں۔ بس آپ کے کھانے پینے کا سب انتظام کر دوں گا۔ آپ تعلیم جاری رکھیں۔"

خانساماں کسی میس میں کام کرتا تھا۔ وہاں سے کھانے پینے کی چیزیں اُڑا لاتا اور کچھ اپنے پیسوں سے خرید لاتا۔ اور کسی نہ کسی طرح صاحب کے کھانے پینے کا انتظام کر دیتا۔ اسے بھوکا نہ رہنے دیتا۔ سال ڈیڑھ سال بعد وہ تعلیم سے فارغ ہوا تو معقول نوکری مل گئی۔ اس نے بھی خانساماں کی وہ قدر کی جس کا وہ مستحق تھا۔ وہ اپنی ساری تنخواہ خانساماں کے حوالے کر دیتا اور وہ صاحب کے رہنے، کھانے پینے، لباس اور دیگر اخراجات کی سربراہی کرتا۔ ولایت جاتے وقت انجنیئر صاحب اپنا تمام سامان اور مال و اسباب اس خانساماں کو دے گئے۔

بڑے بڑے زمیندار اور شرفا بنگلے کے احاطے سے باہر گاڑی سے اُتر کر پیدل بنگلے میں آتے اور اِدھر اُدھر یا درختوں کے سائے میں بیٹھ کر انتظار کرتے کہ صاحب گول کمرے میں آئیں اور ان کو اطلاع ہو تو سلام کو حاضر ہوں۔ کمرے میں جوتے پہن کر آنے کی اجازت نہ تھی۔ شریف اور رئیس ملاقاتی جوتا کمرے کے باہر اُتار کر ننگے پاؤں اندر جاتے۔

سرسید احمد خاں ایک واقعہ بیان کرتے تھے کہ ایک رئیس نے جن کی شہر میں بڑی وقعت تھی اور سرکار دربار میں بھی کرسی نشین تھے۔ ایک روز کلکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کی تیاری کی۔ ایک انگریزی دکان سے پیٹنٹ لیدر کا شو (انگریزی جوتا) اور اپنا مشرقی فیشن کا صاف ستھرا لباس زیب تن کیا اور فٹن میں سوار ہو کر صاحب کے بنگلے پر پہنچ کر اپنی حاضری کی اطلاع کرائی۔ صاحب اس وقت بنگلے کے صحن میں تشریف رکھتے تھے اور کرسی کے سامنے ایک معمولی سا قالین بچھا تھا۔ رئیس صاحب پچاس درجے کا زاویہ بنا کر سلام کو جھکے اور آگے قدم بڑھایا۔ ابھی ان کے پیٹنٹ لیدر کے جوتے نے قالین کے ایک کونے کو مس ہی کیا تھا کہ صاحب نے ڈانٹ کر کہا: "کبھی گھر میں بھی قالین پر جوتا پہن کر بیٹھتے ہو۔" اس زمانے میں جوتے کا یہ قصہ عام تھا۔ انگریز کو یہ گوارا نہ تھا کہ کوئی ہندوستانی جوتا پہن کر ان کے کمرے میں داخل ہو اور وہ انگریز بھی جن کا تعلق سررشتۂ تعلیم سے یا تہذیبی اداروں سے تھا وہ بھی اس کج اخلاقی سے بری نہ تھے۔

ایک برہمن جاگیردار گھرانے کا انقلابی سوشلسٹ : بقیہ صفحہ ۱۸ سے آگے

پالیسی کردار پر مشتمل قوم کے لئے تصور بھی نہیں کی جا سکتی۔ بھارت جس نے خود ایک عظیم طاقت کا کردار۔ مغرب یا مشرق کے اثرات سے آزاد ہو کر۔ ادا کیا تھا اب روس اور امریکہ دونوں کے رحم و کرم پر ہے۔ قوموں کے قائد کی حیثیت سے بھارت اپنے آپ کو اب غلام کی حیثیت میں گرا ہوا دیکھ رہا ہے۔ وہ بڑی طاقتیں جو برسوں تک ہر بڑے بین الاقوامی مسئلے پر بھارت کی حمایت حاصل کرنے کی خواہش مند ہوتی تھیں، اب انہوں نے بھارت کو گردن سے پکڑ رکھا ہے۔ بھارت اب بلاشبہ بین الاقوامی حیثیت کی آخری پستی میں پہنچ چکا ہے۔ اس کے ماضی سے جب، اس کا موازنہ کرتے ہیں تو یہ انتہائی تکلیف دہ اور المناک حیثیت لگتی ہے۔ کبھی بھارت افرو ایشین کانفرنس کی تحریک کے علمبرداروں میں ہوتا تھا۔ اور وہ اب اس کانفرنس میں ڈر اور ہچکچاہٹ کے ساتھ پہنچتا ہے۔ سترہ برس سے کم کے عرصے میں بھارت نے اپنا دائرہ مکمل کر لیا ہے۔ اور بین الاقوامی معاملات میں اپنا اثر و رسوخ ختم کر لیا ہے۔ اچانک وہ بڑھاپے کی منزل کو پہنچ گیا ہے۔

نہرو نے اپنا اثر اچھائی اور برائی دونوں کے لئے استعمال کیا۔ وہ بین الاقوامی بھی تھا۔ اور ایک غیر مصالحانہ قوم پرست بھی۔ وہ دنیا کو ہتھیار گرا دینے اور بھائی چارہ اور امن سے رہنے کی تبلیغ کرتا تھا، لیکن اپنی موت سے پہلے اس نے بھارت کو جنگجو اور لڑاکا بنا دیا۔ اور اپنے تمام ہمسایوں کے ساتھ تنازعات طے کرنے سے انکار کر دیا۔

واقعات کا اجتماع۔ نہرو پر اس قدر بوجھ بن کر گرا کہ آخر کار وہ اس کے تلے دب گیا۔ چین سے ایک مہلک تصادم، پاکستان سے مستقل چپقلش۔ اندرونی صورت حال کی خرابی، آزاد خارجہ پالیسی پر سودے بازی، شیخ عبداللہ کی رہائی، پاکستان میں شیخ کا دورہ، اور اس کا یہ اعلان کہ صدر پاکستان بھارت میں جا کر بھارتی لیڈروں سے مسئلہ کشمیر پر بات کرنے کو تیار ہیں۔ یہ سب کچھ بوڑھے اور بیمار نہرو کے لئے بہت زیادہ تھا۔

نہرو خود ایک تضاد تھا ــــ اس نے تضادات کے تضاد۔ بھارت سے جنم لیا اور اس لئے نہرو بھارت تھا۔ اتنے گہرے جذبات کے ساتھ پنڈت نہرو نے بھارت کو متحد کرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا۔ خود تضادات کا شکار ہونے کے سبب اس نے باہم متصادم عناصر کو خیر و شر دونوں کے لئے استعمال کیا۔ اس کی زندگی نے یہ بات محسوس نہ ہونے دی کہ وہ بنیادی طور پر ایک دوسرے کی مخالف قوتوں کو آخر کار بھارت کی تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔ اس نے ایک ایسی بگھی کی عنان تھام رکھی تھی جسے بہت سے گھوڑے مختلف سمتوں میں کھینچ رہے تھے۔ پنڈت نہرو نے اپنی مرضی کے نتائج کے حصول کے لئے مختلف انتہاؤں کو اکٹھے کر دیا۔ سیاست جس کا وہ ماہر تھا۔ کسی اصول سے اس کی وابستگی لینن یا بسمارک کی طرح کبھی مکمل نہ ہوئی ہر مکتب فکر کے لوگ اس کے بوڑھے درخت تلے بیٹھے شاستری جیسے اعتدال پسند کرشنا مینن جیسے ترقی پسند ڈیسائی جیسے قدامت پسند بھی۔ ایسی مختلف اور متضاد ذہانتوں کے اجتماع نے بھارت کو واضح اور صاف نقطۂ نظر مقصد سے ترقی نہ کرنے دی۔ نہرو کی تمام کوششوں، اور اس کی مستقل تگ و دو کے باوجود بھارت کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔

نہرو کے بارے میں تب آخری فیصلہ کیا ہو سکتا ہے؟ کسی فیصلہ کے لئے ابھی بہت جلدی ہے۔ لیکن تاریخ کی متحرک انگلی نے بہت سی سطریں پہلے ہی لکھ دی ہیں۔ نہرو عام حالات کی پیداوار نہیں تھے۔ جواہر لال نہرو جیسے آدمی ایسے حالات میں پیدا ہوتے ہیں۔ جب نظامِ کائنات دگرگوں ہوتا ہے۔ وہ افق پر ایک مرتبہ ہی پہنچتے ہیں۔ وہ غیر معمولی واقعات اور محرکات کے ایک خاص قسم کے امتزاج کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ نہرو ایک انتہائی مشکل وقت میں ابھرا، جب ہم اپنی تقدیر کے چوراستے پر تھے۔ یہ ان انتہائی بلند شخصیتوں کا زمانہ تھا جنہوں نے ہمیں آزادی لے کر دی۔ نہرو اس انقلابی عہد کا حصہ تھے، جس نے گاندھی، قائداعظم، سبھاش چندر بوس اور مولانا محمد علی جوہر کو پیدا کیا۔ وہ اس مبارک ٹرین کا حصہ تھا۔ جو بھارت کے دل کے ساتھ ساتھ رنگتی رہی۔ نہرو کا طلسم ٹوٹ چکا۔ عوام کو مبہوت کر دینے والا اثر ختم ہو چکا بھارت کے دیرپا اتحاد اور عظمت کی چابی کسی ایک مردِ واحد کے سپرد نہیں کی گئی بلکہ اس کے ساتھ ہی جلا دی گئی ہے۔

غیر ملکی سرمایہ کار اور پاکستان

ولایتی سیٹھوں نے ہمارے وطن میں

۹۰،۴۰،۰۰،۰۰۰ روپے سالانہ لگائے

اور

۱۳،۰۵،۰۰،۰۰۰ روپے نفع وصول کرلیا

الفتح رپورٹ

امریکہ کی جانب سے مالی امداد کے ضمن میں یقین دہانی پر ہمارے دائیں بازو کے اخبارات نے شہ سرخیاں سجا کر جس طور اپنی فخریہ مسرت اور ذہنی دیوالیہ پن کا اظہار کیا ہے، وہ ہم سب کے لئے باعث تشویش ہے۔ ادھر کچھ برس سے بلکہ کھلے لفظوں میں یوں کہیئے کہ عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ ہمارے تعلقات کے استوار ہونے کے بعد سے مغربی سامراج نے جس طرح امداد کی ڈوری ہلا ہلا کر ہمارے قومی وجود کی بار بار تضحیک کی ہے، اس کے پیش نظر حمیت ملی کا تقاضا یہی تھا کہ ہم اقتصادی ترقی کے مغربی فارمولوں اور سانچوں کو دور سے سلام کہتے اور یوں بار بار دوسروں کے آگے دامن پھیلانے کی بجائے اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا سیکھتے اور ہماری آنکھوں میں مغرب کے بخشے ہوئے مشین نما ٹکڑوں کیلئے اصرار کے بجائے اپنے محنت کش ہاتھوں کی عظمت کا اقرار ہوتا الفتح کا موقف ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ قومی غیرت کو چند ڈالروں کے عوض بیچ کھانے کی بجائے ہمیں اپنے وسائل، صلاحیتوں اور قوت پر اعتماد کی راہ اپنانی چاہیئے۔ غیر ملکی اقتصادی امداد پر ضرورت سے زیادہ انحصار ہمیں جس طرح اقتصادی بحران کے دہانے پرلے آیا ہے، اس کے لئے کچھ زیادہ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں

غیر ملکی اقتصادی امداد کا چسکا پاکستان کو ۱۹۵۰ء کولمبو پلان کے آغاز کے ساتھ پڑا۔ امریکہ کے ساتھ تکنیکی امداد کا پہلا معاہدہ فروری ۱۹۵۱ء میں ہوا اور عالمی بنک سے پہلا پروجیکٹ قرضہ ۱۹۵۲ میں لیا گیا۔ غیر ملکی اقتصادی امداد ترقی پذیر ملکوں کو ترقی کے مراحل میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد دیتی ہے لیکن ہمارے ساتھ کچھ ایسا ہوا ہے کہ اس بیساکھی کے ہاتھ آنے سے ہم اپنے پاؤں پر چلنا بھول گئے ہیں۔ اقتصادی ترقی کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کے پیش نظر اس امداد میں جس طرح اضافہ ہوتا رہا ہے۔ ذرا اس کی تفصیل ملاحظہ فرمایئے۔

جبنے ۱۹۵۰ء میں جب کہ پہلی بار غیر ملکی اقتصادی امداد کے دروازے ہم پر کھلے تو اس امداد کا صرف ۳۲ فی صد حصہ قرضے کے طور پر تھا باقی سب امداد گرانٹوں کی صورت میں تھی لیکن پچھلے سال ہمیں جو اقتصادی امداد ملی اس کا ۷٫۴ ۹ فی صد حصہ ہمیں قرضوں کی صورت میں ملا اور قرضے بھی ایسے کہ جن کی کڑی شرائط کا بار اٹھائے

امداد اور قرضوں میں اضافہ

کُل امداد	قرضہ	گرانٹ	عرصہ
سینتیس کروڑ دو لاکھ ڈالر	بارہ کروڑ ایک لاکھ ڈالر	پچیس کروڑ ایک لاکھ ڈالر	۱۹۵۰-۵۵
ننانوے کروڑ ۳ لاکھ ڈالر	اکیالیس کروڑ، لاکھ ڈالر	ستاون کروڑ، لاکھ ڈالر	۱۹۵۵-۶۰ (پہلا پنجسالہ منصوبہ)
دو ارب ۳۶ کروڑ ۶ لاکھ ڈالر	دو ارب دو کروڑ تین لاکھ ڈالر	چونتیس کروڑ پانچ لاکھ ڈالر	۱۹۶۰-۶۳ (دوسرا منصوبہ)
دو ارب ۶۱ کروڑ ۸ لاکھ ڈالر	دو ارب ۵۰ کروڑ، لاکھ ڈالر	انیس کروڑ تین لاکھ ڈالر	۱۹۶۵-۷۰ (تیسرا منصوبہ)
۵۷ کروڑ چار لاکھ ڈالر	چھپن کروڑ ڈالر	ایک کروڑ پانچ لاکھ ڈالر	جولائی، دسمبر ۱۹۷۰ (چوتھا منصوبہ)
سات ارب ۸ لاکھ ڈالر	پانچ ارب باسٹھ کروڑ ۸ لاکھ ڈالر	ایک ارب اڑتیس کروڑ ڈالر	میزان

نہ اٹھے۔

اب چونکہ اقتصادی امداد کا بیشتر حصہ ہمیں قرضوں کی صورت میں مل رہا ہے اس لئے ان کی واپسی اور سود کا مسئلہ بہت اہم ہو گیا ہے۔ بالخصوص اس لحاظ سے کہ ہماری پہلے سے نازک زرمبادلہ کی حالت اس بڑھتے

اگرچہ ہمارے اعداد و شمار کے ماہرین ہمیں بتاتے ہیں کہ پچھلے پنجسالہ منصوبوں کی نسبت اب ہمارا غیر ملکی امداد پر انحصار کم ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس وقت تک ہم تقریباً پانچ ارب باسٹھ کروڑ آٹھ لاکھ ڈالر کے مقروض ہو چکے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک مزے کی بات اور سنیئے

۱۲ کروڑ پاکستانیو!

تم پندرہ ارب،

باسٹھ کروڑ آٹھ لاکھ

ڈالر کے قرضوں تلے

دبے ہوئے ہو

ہوئے بوجھ تلے دب کر اور قابل رحم ہوتی جا رہی ہے ۔ تیس جون ۱۹۷۰ء تک ہمارے آپ کے سروں جو قرضہ چڑھ چکا تھا اس کی تفصیل ملاحظہ ہو

واجب الادا غیر ملکی قرضہ ۳۰ ؍ جون ۱۹۷۰ء

تفصیل	جو قرضہ غیر ملکی زرمبادلہ کی صورت میں واپس ہو گا	جو قرض روپوں کی میں واپس ہو گا	کل
جتنا معاہدہ ہوا	۴۷۶۴،۵۲۱ ملین ڈالر	۳۰۴،۱۸۳ ملین روپے	۵۰۶۸،۷۰۴ ملین ڈالر
جتنی وصولی ہوئی	۳۶۲۵،۴۴۳ ملین ڈالر	۳۰۴،۱۸۳ ملین روپے	۳۹۲۹،۶۲۶ ملین ڈالر
جتنی واپسی ہوئی	۶۷۹،۹۸۳ ملین ڈالر	۷۲،۸۹۵ ملین روپے	۷۵۲،۸۷۸ ملین ڈالر
وصول شدہ اور قابل ادا	۲۹۵۹،۲۲۷ ملین ڈالر	۲۳۱،۲۸۸ ملین روپے	۳۱۹۵،۵۱۵ ملین ڈالر
غیر وصول شدہ قرضہ	۱۱۳۹،۰۷۸ ملین ڈالر	—	۱۱۳۹،۰۷۸ ملین ڈالر
جتنا سود ادا کیا گیا	۳۴۲،۰۷۸ ملین ڈالر	۸۴،۷۸۸ ملین روپے	۴۲۶،۸۶۶ ملین ڈالر

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ ہم اس غیر ملکی امداد کے لئے اب تک ۳۴ کروڑ چھتیس لاکھ اٹھتر ہزار ڈالر اپنے غیر ملکی زرمبادلہ میں سے اور آٹھ کروڑ اکیالیس لاکھ اٹھاسی ہزار روپے ملکی کرنسی کی صورت میں صرف سود کے طور پر ادا کر چکے ہیں ۔ غیر ملکی قرضے میں اضافہ

زیادہ تر پچھلے کچھ سالوں میں ہوا ہے ۔ تیسرے پنجسالہ منصوبے کے دوران اگرچہ قرضہ اندازے کی نسبت کم وصول ہوا ۔ لیکن ہم پر واجب الادا رقم میں شرائط کے مزید کڑے ہو جانے کی بنا پر اور زیادہ اضافہ ہو گیا ہے اس دوران قرضہ دینے والے ملکوں نے سود کی شرح میں ۵ فی صد اضافہ کر دیا ۔ جب کہ واپسی کے عرصہ میں کمی کر دی گئی ۔ نئے بجٹ میں دیئے گئے اعداد و شمار کے مطابق اب ہمیں سالانہ ۲۰ کروڑ ڈالر واپس کرنے ہوں گے اور یوں ۷۱-۱۹۷۰ء کے مالی سال کے دوران کمائے گئے غیر ملکی زرمبادلہ کا پانچویں سے بھی زیادہ حصّہ اس کھاتے میں چلا جائے گا ۔ جب کہ ۶۱-۱۹۶۰ء میں ہمیں اپنے کمائے گئے زرمبادلہ کا صرف ۳،۶۰ فیصد اس حساب میں ادا کرنا پڑتا تھا ۔

غیر ملکی امداد یقیناً اقتصادی ترقی کے مراحل میں غیر ترقی یافتہ قوموں کے لئے ممد ثابت ہو گی ۔ مناسب اعداد و شمار کی عدم موجودگی میں ہم اس ضمن میں کوئی دو ٹوک رائے نہیں دے سکتے لیکن اقتصادی ماہرین کا خیال ہے کہ اس امداد کے تحت مجوزہ منصوبوں میں ہم نے غیر ملکی ماہرین اور ٹیکنالوجی پر کچھ ضرورت سے زیادہ ہی انحصار کیا ہے ۔ اکثر ایسا ہوا کہ مقامی حالات کو نظر انداز کر کے غیر ملکی عوامل اور نظم کار کو براہ راست درآمد کر لیا گیا ہے ۔ جس کی بنا پر ہم مقامی حالات کے مطابق انتظامی اور تکنیکی مہارت پیدا نہیں کر پائے ۔ ہمارے اپنے حالات کا تقاضا ہے کہ مشینوں پر از حد انحصار کی بجائے دستی طریقوں کو زیر استعمال لیا جاتا ہے ۔ کیونکہ ہمارے

ہم اُن کے لئے کپڑا بُنتے رہے، وہ ہمارے لئے میزائل تیار کرتے رہے

ملک میں دستی محنت کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور یہ ذریعۂ پیداوار ہمیں اقتصادی لحاظ سے سستا بھی پڑتا۔ ایسا کرنے سے شاید پیداوار میں اضافے کی رفتار نسبتاً کم رہتی لیکن جدید آلات کار کی مناسب تربیت کے ساتھ ہم یقینی طور پر اپنا کاج آپ سنوارنے کے قابل ہو جاتے۔

موجودہ حالات میں ہمیں جو قیمت ادا کرنی پڑی ہے اس کے ایک محدود پیمانے پر انداز کے لئے ہم فی الحال غیر ملکی امداد کے صرف غیر ملکی نجی سرمایہ کاری کے شعبے کا تجزیہ پیش کر سکتے ہیں۔ پاکستان میں غیر ملکی نجی سرمایہ کاری کو فروغ دینے کے لئے حکومت بہت سی رعایتیں اور ترغیب دیتی ہے۔ مزید برآں اس سرمایے کا سارا منافع سرکاری شرح پر بیرون ملک لے جایا جاسکتا ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۶۷ء تک اس شعبے سے دو ارب ننانوے کروڑ ستر لاکھ روپے پرائیویٹ سیکٹر میں خرچ ہو چکے تھے۔ یہ اعداد و شمار سٹیٹ بنک آف پاکستان کے تیار کردہ ہیں اور اس ضمن میں سہولت کے لئے غیر ملکی سرمایہ کاری کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) سرمایہ جو لایا گیا۔

(۲) جو آلات اور مشینیں لائی گئیں

(۳) اس سرمایہ سے کمائی گئی جو آمدنی دوبارہ پاکستان ہی میں لگائی گئی۔

وہ آمدنی جو دوبارہ پاکستان ہی میں لگائی گئی، اسے براہ راست نجی سرمایہ کاری کے کھاتے میں رکھا جاتا ہے، کیونکہ یہ رقم جوں کی توں باہر لے جائی جاسکتی ہے۔ ان اندازوں کے مطابق پاکستان میں غیر ملکی نجی سرمایہ کاری کی اوسط آٹھ کروڑ روپے سالانہ پڑتی ہے۔ ۶۸-۱۹۶۷ء میں یہ رقم تقریباً نو کروڑ چار لاکھ تک چلی گئی تھی، اس کے مقابلے میں جو رقم اس شعبے سے سٹیٹ بنک کے ذریعے نفع، DIVIDEND، رائلٹی، ٹریڈ مارک اور ٹیکنیکی اجرت کے طور پر بیرون ملک منتقل ہوئی، اس کی اوسط ۶۵-۱۹۶۴ء سے ۶۸-۱۹۶۷ء کے درمیان تیرہ کروڑ ۵ لاکھ روپے سالانہ رہی۔ یعنی غیر ملکی سرمایہ کاروں سے ہمارے ہاں آٹھ کروڑ روپے سالانہ آئے اور ان کے عوض تیرہ کروڑ پانچ لاکھ روپے سالانہ کما کر وہ باہر لے گئے۔ اس رقم میں سے اگر ان کی رائلٹی، ٹریڈ مارک اور ٹیکنیکی اجرت کی رقوم نکال بھی دی جائیں تب بھی صرف منتقل شدہ نفع اور (Dividents) کی رقم آٹھ کروڑ تین لاکھ روپے سالانہ تک جا پہنچتی ہے۔ اس شعبے میں باہر سے آنے والے سرمایے اور پاکستان سے باہر منتقل ہونے والے سرمایے کا ایک تقابلی جائزہ ملاحظہ ہو۔

غیر ملکی نجی سرمایہ کاری، آمد و منتقلی

سال	کل غیر ملکی نجی سرمایہ کاری مقامی کمائی جو دوبارہ لگائی گئی	جو رقم اس شعبے سے باہر منتقل ہوئی	فیصد منتقل شدہ رقم
۱۹۶۴-۶۵	سات کروڑ تہتر لاکھ روپے	تیرہ کروڑ اسی لاکھ روپے	۱۷۹ فیصد
۱۹۶۵-۶۶	آٹھ کروڑ بہتر لاکھ روپے	نو کروڑ نوے لاکھ روپے	۱۱۴ فی صد
۱۹۶۶-۶۷	نو کروڑ انیس لاکھ روپے	تیرہ کروڑ چھیاسی لاکھ روپے	۱۵۱ فی صد
۱۹۶۷-۶۸	آٹھ کروڑ چالیس لاکھ روپے	پندرہ کروڑ تینتیس لاکھ روپے	۱۸۱ فیصد

(بشکریہ سٹیٹ بنک آف پاکستان و ڈیپارٹمنٹ آف انوسٹمنٹ پروموشن اینڈ سپلائز)

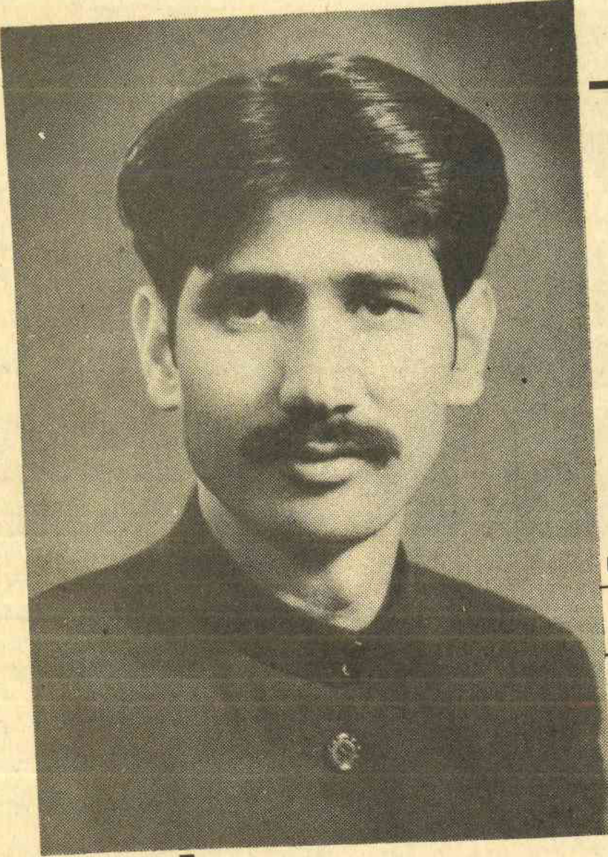
اس جائزے سے ظاہر ہوتا ہے کہ نجی سرمایہ کاری کے ضمن میں جتنا سرمایہ پاکستان میں آیا، اس کا تقریباً ۱۵۰ فی صد صرف نفع اور رائلٹی وغیرہ کی صورت میں پاکستان سے باہر منتقل ہو گیا۔ صرف نفع کی شرح اصل سرمایے کے ۹۴ فی صد تک جا پہنچتی ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سرمایہ کاری کے ضمن میں دی گئی رقوم میں اس سرمایے سے کمائی گئی وہ مقامی آمدنی بھی شامل ہے جو دوبارہ لگا دی گئی۔ یعنی باہر سے آنے والا اصل سرمایہ اس سے بھی کم تھا۔

اس ضمن میں قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں غیر ملکی سرمایہ داروں نے صرف ایسی صنعت میں سرمایہ کاری کی ہے، جو انہوں نے اپنی سیاسی مصلحتوں کے سبب بہتر خیال کی۔ مثلاً ہمارے ہاں ٹیکسٹائل مل اور جیوٹ مل کی طرف تو توجہ دی گئی۔ اور خاص ملیں لگائی بھی گئیں لیکن ان میں بھی صرف ایک حد تک اتنا مال تیار کیا گیا جو چند خاص ملکوں کی ضرورتیں پورا کر سکے۔ اس کے علاوہ کسی اور کو مال فروخت نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ۲۳ سال میں ہمارے ہاں غیر ملکی سرمایہ داروں نے اور غیر ملکی امداد کے ذریعے ہمارے سرمایہ داروں نے اربوں روپے کی صنعتیں قائم کیں۔ مگر ہم "فالتو پرزوں" کی کوئی صنعت اب تک قائم نہ کر سکے۔ سٹیل مل کے منصوبوں پر تو لاکھوں روپے صرف ہوئے لیکن مل ابھی تک قائم نہ ہو سکا۔ ایک ٹیکسٹائل مل ۲۵۰۰۰ تکلوں پر مشتمل ۷۰ لاکھ میں آجاتا ہے۔ جیوٹ مل ۷۰ لاکھ میں جب کہ ایک جہاز ۲½ کروڑ روپے آبدوز ۳½ کروڑ روپے اور کمپیوٹر راڈار وغیرہ کی قیمتیں ۲½ کروڑ سے شروع ہوتی ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس زمانے میں کونسی چیزیں زیادہ اہم ہیں۔ غیر ملکی سرمایہ دار کونسی چیزیں فروخت کرنے میں دلچسپی لیں گے۔ ٹیکسٹائل مل وغیرہ وہ ہم لوگوں کو اس لئے دے دیتے ہیں کہ ہم انہیں یہ مال بنا کر دیں، اس سلسلے میں ان کا جو وقت بچے، وہ اپنی جنگی صنعت کے لئے وقف رکھیں، ان کی جنگی صنعت چلتی رہے۔ ہمارے ہاں کہیں امریکن کپڑا، ٹائپ رائٹر گاڑی درآمد نہیں ہوتی۔ درآمد ہوتے ہیں تو صرف ہتھیار اور ہتھیار۔ ایک ایک ہتھیار کی قیمت تین چار ٹیکسٹائل ملوں کے برابر ہو جاتی ہے۔ غیر ملکی سرمایہ کاری کا یہ پہلو بھی غور طلب ہے کہ وہ ہمارے ملک میں پیسہ لگا کر احسان بھی کرتے ہیں ہماری صلاحیتوں اور ضرورتوں سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں، لیکن ہماری محتاجی کو ختم نہیں ہونے دیتے۔

آپ اس جائزے سے جو نتیجہ چاہیے اخذ کر لیجئے ہمارے خیال میں یہ سرکاری اعداد و شمار دائیں بازو کے اخبارات کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہونے چاہیئں۔ کیا ہم اپنی ترقی کی قیمت اسی طور ادا کرتے رہیں گے کہ غیر ملکی سرمایہ کار ہر سال اپنے سرمایے کا ۱۵۰ فی صد ہمارے یہاں سے صرف نفع کی صورت میں باہر لے جائے۔ اسے ہم اپنا مقدر جانیں یا استحصال کی بدترین صورت۔

صحافت کا ایک سال

روزنامہ جسارت نے اشاعت سے پہلے ہی خبر دی، اشتراکی ہفت روزہ "الفتح" شائع نہیں ہوگا



"الفتح" کے مدیر ارشاد راؤ نے لکھا

ہفت روزہ "الفتح" کی کہانی پاکستان میں آزاد صحافت کی کہانی ہے

ڈیڑھ سال گذر چکا ہے۔

پاکستان میں صحافت کا طالب علم جنوری ۷۰ء کی ...امل صحافیوں کے خلاف گھناؤنی اور عوام دشمن سازش ...نظر ڈالتا ہے۔ تو اس کے جسم میں غم و غصے کی لہر دوڑنے ...تی ہے۔ وہ اُن مجرموں کا کھوج لگاتا ہے۔ جنہوں نے ...لستان کو انڈونیشیا بنانے کے زعم میں عوام دوست ...حافیوں کا معاشی قتل عام کیا۔ وہ قلم اٹھاتا ہے اور یہ ...فاظ لکھنے پر مجبور ہوتا ہے: "پاکستان کی تاریخ کے ...یاہ ترین دور کا آغاز ۷۰ء میں ہوا۔ ایک منصوبہ بنایا ...یا۔ اس کے مطابق عوام دشمن طاقتوں نے جاگیرداروں، ...رمایہ داروں، نوکر شاہی اور غیر ملکی آقاؤں بالخصوص ...ریکی سامراج کے ایجنٹوں کو پاکستان کے پہلے عام انتخابات ...ں کامیاب کرانے کے لیے ذرائع ابلاغ (اخبارات) پر ...ل قبضہ کر لیا۔ وہ عامل صحافی جو امریکی سامراج، پاکستان ...، بڑے سرمایہ دار، جاگیر دار اور نوکر شاہی سے نفرت ...تے تھے اور مظلوم طبقے کے ہمنوا تھے انہیں ملازمتوں ...، برطرف کر دیا گیا۔ آزادیٔ صحافت پر یہ پہلا حملہ نہ تھا۔

ایوب خاں اور اس سے پہلے حاکموں نے اپنے اپنے راج سنگھاسن کو قائم کرنے کے لیے بھرپور وار کیے تھے۔ ایوب خاں نے نیشنل پریس ٹرسٹ بنا ڈالا تھا۔ اس کے گوئبلز اس سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ۷۰ء کو اپنے سینے پر سیاہ داغ دیکھنا تھا۔ اس کے حصے میں نوابزادہ شیر علیخاں آیا"۔

جنرل آغا محمد یحییٰ نے اقتدار سنبھالتے ہی عوام سے وعدہ کیا کہ وہ ملک میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عام انتخابات کرائیں گے۔ فوج بیرکوں میں واپس چلی جائے گی۔ عوامی نمائندے ملک چلائیں گے۔ صدر یحییٰ کا یہ اعلان عوام دشمن اور ظالموں پر بجلی بن کر گرا۔ انہیں اپنے کرتوت کے انجام کا علم تھا۔ ۲۳ سال تک وہ اسلام کے مقدس نام، نظریۂ پاکستان اور ملک کے استحکام اور سالمیت کا ڈھونگ رچا کر حکمرانی کرتے رہے۔ اقتدار سنبھالتے ہی انہوں نے لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کیا۔ سرمایہ چند ہاتھوں میں جمع ہو کر رہ گیا۔ ملازمتیں رشتے داروں کو الاٹ ہونے لگیں۔

مہنگائی انتہا کو پہنچی۔ بیروزگاری نے ڈیرے ڈال دیئے عوام نے جب کبھی اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تو اُن کے سینے گولیوں سے چھلنی کر دیئے گئے۔ خون کی ارزانی کا عالم یہ تھا کہ وہ سرمائے دار اور جاگیردار کے منہ لگ گیا۔ عام انتخابات میں یہ کیسے کامیاب ہوتے؟

امریکی سامراج، بڑے سرمایہ دار جاگیردار اور نوکر شاہی نے حالات کا بغور جائزہ لیا۔ انہیں اخبارات پر مکمل قبضے اور ذرائع نشر و اشاعت کو پورے طور پر اپنے کنٹرول میں لینے کی صورت میں کامیابی کے امکانات روشن نظر آئے۔ اس موقع پر نواب زادہ شیر علی خاں وزیر اطلاعات و قومی امور تھے انہوں نے اپنی خدمات پیش کیں۔ یقین دلایا کہ نیشنل پریس ٹرسٹ اُن کے گھر کی لونڈی ہے۔ باقی اخبارات کی بھی کیا مجال ہے۔ کہ وہ وزیر اطلاعات سے ٹکر لیں لہٰذا اخبارات پر قبضہ کا پلان تیار کیا جائے۔

میں ان دنوں مشرق کراچی میں تھا۔ یہ اخبار انتظامیہ کی نااہلی کی وجہ سے بیگار کیمپ بن چکا تھا۔ اس رویے سے تنگ آکر فرہاد زیدی حریت چلے گئے تھے اور ان کے ساتھ

سالنامہ



صحافیوں کی جدوجہد کا یہ کارواں آج بھی رواں دواں ہے

صحافیوں کی ایک کھیپ نے بھی ملازمت چھوڑ دی۔ ان میں سٹی ایڈیٹر۔ نائٹ شفٹ انچارج، متعدد سینئر سب ایڈیٹر، سب ایڈیٹر اور رپورٹر تھے۔ انتظامیہ نے اتنی ساری آسامیوں کو پُر کرنے کے لیے بھرتی کھولی اور ایم۔اے، ایم۔اے ایل ایل بی اور گریجویٹ نوجوان ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپے میں ملازمت پر رکھ لیے۔ ان سے وعدہ کیا گیا کہ انہیں مستقل آسامیوں پر رکھا گیا ہے لہٰذا تین ماہ کے بعد تقررنامے جاری کر دیئے جائیں گے۔ تین ماہ گذر گئے تو چند نوجوانوں نے مشرق کے چیف ایڈیٹر جناب اقبال زبیری سے اسکیل کے مطابق تنخواہ اور تقررناموں کے اجراء کے لیے درخواست کی۔ انہوں نے دلاسا دیا، کہ مینجنگ ڈائرکٹر عنائت اللہ غیر ملکی دورے سے آجائیں تو کام ہو جائے گا۔ یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا۔ پانچ مہینے کے بعد تحریری طور پر نئے صحافیوں کو مطلع کیا گیا کہ انہیں اپرنٹس کے طور پر ملازم رکھا گیا ہے۔ تنخواہ وہی ڈیڑھ سو روپے (شاید ایک صاحب کو دو سو روپے دیے گئے اور وہ عبدالغفار رحمانی ہیں۔) یہ پروانے ملتے ہی مشرق کے "اپرنٹسوں" نے اپنے مستقبل کے لیے اجتماعی غور کیا۔ نوجوان خون گرم ہوتا ہے۔ ان کا فیصلہ اس کی بھرپور عکاسی کر رہا تھا "اسکیل کے مطابق تنخواہ یا استعفے"۔ ان میں سے ایک صاحب میرے پاس آئے۔ انہیں کسی نے بتا دیا کہ میرے چیف ایڈیٹر سے بہتر تعلقات ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ آپ کی اطلاع درست ہے۔ زبیری صاحب میرے استاد ہیں لیکن . . . . لیکن کہہ کر میں رُک گیا۔ کہ ان سے یہ کیسے کہوں کہ وُہ بے بس ہیں، چیف ایڈیٹر ضرور ہیں مگر صحافت کا وہ دور لد گیا جب ایڈیٹر فیصلہ کرتے تھے۔ اب تو جنرل مینجر اور مینجنگ ڈائریکٹر بزنس کے انداز میں کاروبار چلاتے ہیں۔

یہ نوجوان حیران تھا کہ چیف ایڈیٹر لیکن کا شکار کیوں ہو گئے ہیں۔ وہ کہنے لگا! بھائی، بیروزگاری بہت ہے۔ ہم ٹکر لیں گے تو زیادہ سے زیادہ نوکری چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ بہت سے ایم اے بیکار پھر رہے ہیں۔ صحافی کا کام ترجمہ کرنا تو رہ گیا ہے۔ انہیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے والے مل جائیں گے۔ میں نے حامی بھر لی حالانکہ میں جانتا تھا کہ یہ وعدہ میری برطرفی کی صورت میں رونما ہو گا۔

ان نوجوان کو گریڈ دلوانے کی جدوجہد بڑی طویل ہے۔ اس میں مشرق کی انتظامیہ کی وہ غیر انسانی حرکتیں بھی شامل ہیں جو نو ماہ تک میرے تبادلے اور اذیت کا باعث بنیں۔ یہ چونکہ ذاتی ہے لہٰذا اسے کسی اور وقت کے لیے چھوڑ رہا ہوں۔ تاہم اس عرصے میں مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ ملک بھر کے اُن صحافیوں کی فہرست تیار ہو رہی ہے جو اشتراکی ہیں یا جنہیں عوام دوستی کے جرم کی پاداش میں اخبارات کی انتظامیہ نے اشتراکی قرار دے دیا۔ ہوا یوں کہ ایک دن مجھے مشرق لمیٹڈ کے مینجنگ ڈائریکٹر مسٹر عنائت اللہ نے اپنے کمرے میں طلب کیا۔ اس وقت ریذیڈنٹ ایڈیٹر عرفان غازی موجود تھے۔ باتوں باتوں میں کہنے لگا: "دیکھو جی، سانوں تے علم ہن ہویا اے، راؤ صاحب تے انٹرنیشنل لیڈر نیں۔ اینہاں توں ڈرو" (ہمیں اب علم ہوا ہے۔ راؤ صاحب تو انٹرنیشنل لیڈر ہیں۔ ان سے ڈرو۔) میں سوچ میں پڑ گیا کہ عنائت صاحب کو کیا ہو گیا۔ اپرنٹسوں سے عملی ہمدردی نے مجھے انٹرنیشنل لیڈر کیسے بنا دیا۔ میں نے ذرا کریدا۔ رپورٹری کے کرتب عنائت صاحب پر آزمائے۔ مجھے اس میں کامیابی ہوئی۔ کہنے لگا "پتہ چل گیا اے تسی سرخے ہو۔ کیمونسٹ۔ کیوں بن دے او" (ہمیں پتہ چل گیا ہے۔ تم سرخے ہو۔ کیمونسٹ۔ کیوں بن رہے ہو) میں نے اپنے حلقے کے صحافی دوستوں سے اس بات کا بالخصوص تذکرہ کیا۔ دو چار روز میں ہم نے پتہ کر لیا کہ اعلیٰ سطح پر ایسے صحافیوں کی فہرست تیار کی گئی ہے جو بائیں بازو کی سوچ رکھتے ہیں۔ یہ فریضہ معاصر اردو ڈائجسٹ، زندگی کے مدیر جناب الطاف حسن قریشی اور چٹان کے مدیر جناب شورش کاشمیری کی ٹیم نجی طور پر ایک سیاسی جماعت کے کارکنوں کی مدد سے اور نیشنل پریس ٹرسٹ کی انتظامیہ اور نواب زادہ شیر علی خاں کے سرکاری عملے نے تیار کی۔ اخبارات کے مالکان کا ٹھیکہ فارلینڈ کے دوست اور پی۔پی۔آئی کے مینجنگ ڈائریکٹر مسٹر معظم علی نے لے لیا تھا۔ برطرفیوں کی ایک طویل فہرست مرتب ہو چکی تھی۔

خطرے کی گھنٹیاں زور زور سے بج رہی تھیں۔ مجھے مشرق کی انتظامیہ بھوکوں مارنے پر تلی ہوئی تھی۔ ان دنوں پریس کلب میں زیادہ وقت گذرتا تھا۔ ڈیلی نیوز کے ایس۔ایم۔فضل، ڈان کے ہمدان امجد علی، جنگ کے عبدالحمید چھاپرا میرے اس دور کے ساتھی ہیں جو پریس کلب کی نشستوں کے دوران اتنے نزدیک آ گئے کہ ان سے مالکان کے خلاف صحافیوں کی منصفانہ جدوجہد اور آزادیٔ صحافت کے بارے میں پروگرام بنانے میں خوشی

کاپیاں لے کر ملّت پریس میں

پہنچے تو انقلاب صاحب، نے کہا:

"یہ پرچہ ہم شائع نہیں کر سکتے"

سالنامہ

الفتح

جماعتِ اسلامی نے

صحافیوں سے

پکوڑے تلوائے



محسوس ہوتی ۔ان کے سوا اخبار جہاں کے ایڈیٹر انچارج جناب محمود شام اس لحاظ سے واحد صحافی تھے جو دِلی ہمدردی کے علاوہ عملی طور پر ساتھ دینے پر ڈٹے ہوئے تھے ۔میں جب کبھی اخبار جہاں کے دفتر میں داخل ہوتا تو جنگ کی انتظامیہ کے ایجنٹ تیوریاں چڑھا لیتے۔عامل صحافی ایک دوست کی حیثیت سے خندہ پیشانی سے پیش آتے ۔شام صاحب سے ملاقات ہوتی تو میں محسوس کرتا کہ آزادیٔ صحافت کے مشن کی تکمیل کے لیے میں اکیلا نہیں کہ مولانا محمود شام مجھ سے زیادہ آگے بڑھے ہوئے ہیں ۔انہیں اس بات کی پرواہ بھی نہیں کہ میر صاحبان ملازمت سے جواب دیدیں گے ۔اُن تک یہ بات پہنچ چکی تھی کہ میری ملاقات جس کسی سے بھی ہے ، اس کی ملازمت محفوظ نہیں ۔مشرق کی انتظامیہ کا یہ نعرہ "بچ کے رہو" خطرناک آدمی ہے ۔" دوسرے اخبارات تک پہنچ چکا تھا ۔جنگ کا مدنی اور بھوپالی (سپر گروپ) اے پی پی کا گردیزی گروپ ڈان کا لطیف جعفری گروپ ،حریت کا ہمایوں عزیز گروپ اور مشرق کا سلیم ارشد ،علی اختر ،عرفان غازی (متحدہ محاذ برائے عنائت اللہ) آزادیٔ صحافت کے قافلے کے خلاف سرگرم عمل تھا ۔ان میں سے بعض کو انتظامیہ کی کھلم کھلا اور کئی ایک کو درپردہ حمایت حاصل تھی ۔ان کے ساتھ وہ نام نہاد صحافی بھی تھے جنہیں سی ۔آئی ڈی (پولیس) نے صحافی بنا دیا ہے اور جو اپنے محکمے کے لیے کام کرتے ہیں ۔

مارچ تک حالات یوں بن چکے تھے ۔

دائیں بازو کی انتہا پسند سیاسی جماعت، امریکی سامراج اور سرمایہ دار، جاگیر دار کے مخالف صحافیوں کی فہرست تیار ہو چکی تھی ۔

نوابزادہ شیر علیخاں اور ان کے سرکاری عملے کی ہدایات کی روشنی میں فہرست میں نام زد صحافیوں کے خلاف مالکانِ اخبارات نے تادیبی کارروائیاں شروع کر دی تھیں ۔

داہیں بازو کے گوئبلز الطاف حسن قریشی اور مدیر چٹان شورش کاشمیری نے مذکورہ صحافیوں کے خلاف جال بچھا دیا تھا ۔کراچی ،لاہور اور راولپنڈی میں مورچے تعمیر کر کے حملے کی مکمل تیاریاں کر لی گئیں ۔اس ضمن میں ہفت روزہ زندگی لاہور نے سب سے پہلے "پورس کے ہاتھی" کے عنوان سے انجمن صحافیان پاکستان کے خلاف ایک بے بنیاد ،من گھڑت اور لغو مضمون شائع کیا ۔اس مضمون کی تیاری نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبار مشرق لاہور میں ضیاء الاسلام انصاری نے کروائی ۔لاہور میں صحافتی جن سنگھیوں کے کاغذی مورچے کے کمانڈر یہی حضرت تھے ۔انہیں "اسلام پسندوں" کے

میر خلیل الرحمان نے انجمن پریس کو بھی "الفتح" چھاپنے سے منع کر دیا

علاوہ مشرق اور نیشنل پریس ٹرسٹ کی پوری انتظامیہ کی حمایت حاصل تھی ۔کراچی میں جنگ کے محمود احمد مدنی اس گروہ کے سرخیل تھے ۔ان کے ساتھ مشرق کے سلیم ارشد ،عرفان غازی (باقی اُن کے پیچھے) اے پی پی کے گردیزی ، اے پی پی کے مرحوم فوٹوگرافر ایڈیٹر یاسین ،ڈان کے جعفری ،حریت کے تسکین علیگ ، صلاح الدین اور کشش صدیقی تھے ۔

ان کی کمان پی پی آئی کے مینجنگ ڈائریکٹر مسٹر معظم کے ہاتھ میں تھی ۔لیکن پاکستان کے صحافیوں کی آزادیٔ صحافت کے لیے عظیم جدوجہد کا جب کبھی تذکرہ ہوگا ۔پی پی آئی کے عامل صحافیوں کی بے پناہ قربانیوں کو ضرور سراہا جائے گا ۔اس ادارے کے کراچی میں ایک صحافی کے علاوہ باقی تمام بڑی سے بڑی قربانی دینے پر ڈٹے رہے حتیٰ کہ مسٹر معظم کے ایک قریبی رشتہ دار مسٹر عاصم علی بھی آخری دم تک صحافیوں کے ساتھ رہے ۔لاہور میں اس ادارے کے ایک مینجر مسٹر بشیر قریشی نے کافی گندہ اور عوام دشمن رول ادا کیا ۔راولپنڈی میں مسٹر محمود اور پاکستان ٹائمز کے مسٹر شاہ "اسلام پسندوں" کے ٹاؤٹ تھے ۔ان کی رسائی نوابزادہ شیر علی خاں تک براہِ راست تھی ۔

اے پی این ایس (مالکانِ اخبارات کی انجمن کا نام ہے ۔) پر میر خلیل الرحمان اور ہارون گروپ کا قبضہ تھا ۔ہارون پرانے بڑے سرمایہ داروں میں سے ہیں ۔ڈان ،حریت ،ہیرالڈ ،ڈان گجراتی شائع کرتے ہیں ۔میر خلیل الرحمان نئے اور بڑے سرمایہ دار ہیں ۔جنگ کے علاوہ نیشنل بنک آف پاکستان بینز داؤد پیٹرولیم خیبر انشورنس کمپنی ،السبیلہ نیوی گیشن اور دوسری متعدد صنعتی کمپنیوں اور اداروں کے ڈائریکٹر ہیں ۔ان کے رویے کا اندازہ موجودہ سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش سے لگایا جا سکتا ہے ۔سرمایہ دار کی حیثیت میں اوّل تو یہ وزیر اطلاعات کو ناراض نہیں کر سکتے تھے دوم سرمایہ دار عوام دوست ہو جائے تو وہ سرمایہ دار نہیں رہتا ۔انہوں نے اپنے

"پتہ چل گیا اے تُسی سُرخے او — کمیونسٹ — " کہا عنایت اللہ نے

طور پر منصوبہ کو مزید تقویت پہنچائی۔ صحافتی جن سنگھیوں کی مکمل حمایت حاصل کی۔ باقی نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات کے ملازم پیشہ افسران تو نواب زادہ صاحب کو حُسن کارکردگی دکھانے پر تلے ہوئے تھے۔ انہیں اڑھائی اڑھائی تین تین ہزار روپے تنخواہ کے علاوہ ذاتی کاروبار چلانے کی سہولت اسی لیے ملی ہوئی تھی۔ ان کا نعرہ تھا۔ "کچل دو"۔ یہ بات دوسری ہے کہ "کچل دو" کے الفاظ ادا کرنے کے بعد دل کے دورے بھی پڑنے لگتے تھے۔

اس کے مقابلے میں انجمن صحافیانِ پاکستان اور عامل صحافی خوشنویس یونین کے پرچم تلے عامل صحافی اور خوشنویس جمع ہو چکے تھے۔ ان کا اتحاد اس لیے نہیں تھا کہ ایک منظم سازش کے تحت اخباری صنعت میں معاشی قتل عام ہونیوالا ہے۔ ایک مخصوص فکر اور سوچ کے مالک صحافیوں کو اخبارات سے جواب مل جائے گا بلکہ خوشنویسوں سے اتحاد خالصتاً دوسرے ویج بورڈ ایوارڈ کے مطابق مالکان سے قانونی معاشی حقوق حاصل کرنے کے لیے تھا۔ انجمن صحافیانِ پاکستان کی قیادت اُن افراد یا شخصیات کے ہاتھ میں تھی۔ جن کے خلاف صحافتی جن سنگھی، دائیں بازو کی تمام سیاسی جماعتیں نواب زادہ شیر علی خاں اور مالکانِ اخبارات سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے واضح اور مضبوط متحدہ محاذ بنا چکے تھے۔ نواب زادہ شیر علی خاں نپولین کا یہ قول اکثر نجی مجالس میں دہراتے ہوئے سنائی دیتے۔

"دشمن کی مسلح افواج پر قبضہ کرنے سے بہتر اور موثر حملہ یہ ہوگا۔ کہ اس ملک کے اخبارات پر قبضہ کر لیا جائے"

انجمن صحافیان پاکستان نے بلاشبہ خوشنویس برادری کا بھرپور اتحاد حاصل کر کے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ چونکہ اس کی بنیاد معاشی تھی اور سیاسی بنیادوں پر انجمن صحافیان پاکستان ایسا کر بھی نہیں سکتی تھی لہذا مقابلے کے لیے انجمن صحافیانِ پاکستان کو مناسب طریقے اختیار کرنا چاہیئے تھے۔

انجمن صحافیان پاکستان نے مالکان اخبارات کو عامل صحافیوں کے حقوق سلب کرنے اور دوسرے اُجرت بورڈ کی سفارشات پر عملدرآمد نہ کرنے کی وجوہ پر نوٹس دیدیئے۔ مالکانِ اخبارات نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس کی پروا نہ کی۔ ہڑتال کا نوٹس دینے سے قبل انجمن نے پرادفشل یونٹوں کو ہدایات جاری کیں کہ وہ مطالبات کی روشنی میں انجمن کے ارکان سے خفیہ رائے شماری کے ذریعے فیصلہ لیں کہ وہ ہڑتال کے حق میں ہیں یا نہیں۔

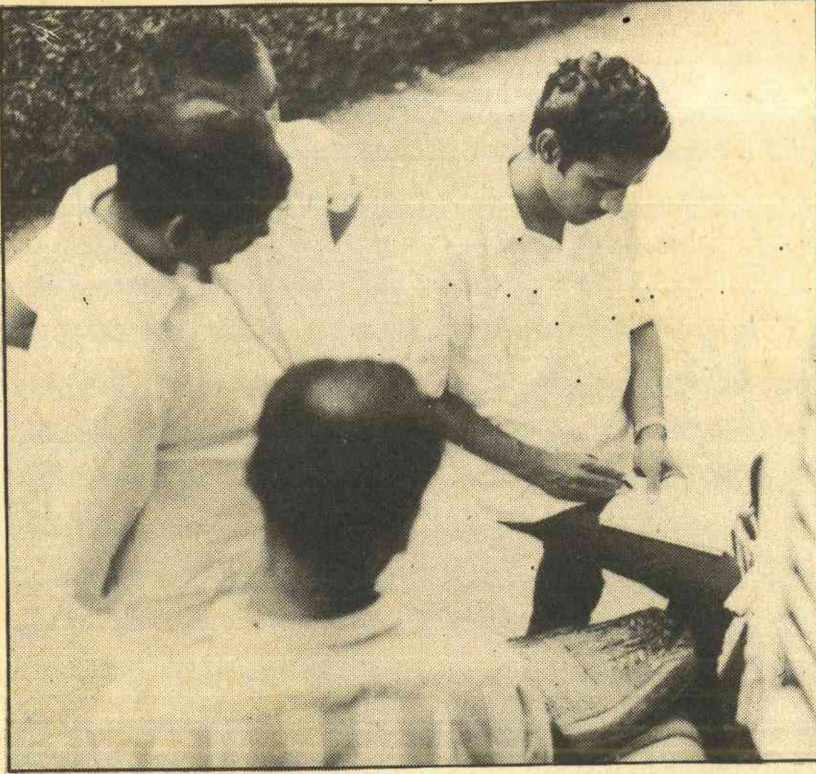
کراچی کے ۲۴۸ ارکان میں سے صرف ۱۳ ارکان نے ہڑتال کی مخالفت میں ووٹ دیے اور مجموعی طور پر پورے پاکستان میں ۹۸ فیصد کے لگ بھگ صحافیوں نے انجمن کو اختیار دیا کہ وہ مطالبات منظور ہونے تک غیر معینہ مدت تک ہڑتال پر جانے کے نوٹس دیدے۔

انجمن نے ملک گیر ہڑتال کے نوٹس جاری کر دیئے مالکان کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ وزیر اطلاعات "غیر جانبداری" کی آڑ میں اپنا کام دکھانے میں مصروف ہو گئے۔ انجمن نے دوبارہ خفیہ رائے شماری کرائی اور بالآخر اکثریت کی رائے کا احترام کرتے ہوئے ۱۵ اپریل سے ہڑتال پر جانے کا نوٹس دیدیا۔

ہڑتال پر جانے سے پہلے مجھے ہفت روزہ الفتح کا ڈیکلریشن مل چکا تھا۔ جناب محمود شام۔ ایس۔ ایم۔ فضل ہمدان امجد علی اور عبدالحمید چھاپرا اس جریدہ کو آزاد صحافت کا ترجمان بنانے کے لیے اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا تھا۔

۱۵ اپریل ۷۰ء کو مالکان اخبارات کے سامنے صحافیوں کی طاقت کا مظاہرہ ہونا تھا۔ ۱۴ اپریل کو انجمن صحافیانِ پاکستان کے صدر جناب کے۔ جی مصطفےٰ، سکریٹری جنرل جناب منہاج برنا، ممتاز صحافی اور انجمن صحافیانِ پاکستان کی مجلس عاملہ کے رکن جناب آئی۔

اب صحافی اپنے اخبار سے پہلے سی۔ آئی۔ ڈی کو رپورٹ پہنچاتے ہیں



ٹرسٹ کے ایک مقامی اخبار کا سب ایڈیٹر سی آئی ڈی والوں کو ایک جلسے کی رپورٹ لکھ کر دے رہا ہے

اے۔ رحمان ڈھاکہ اور لاہور سے کراچی پہنچ چکے تھے لاہور کے محاذ پر صحافیوں کی جانب سے حسین نقی اور حمید اختر، راولپنڈی میں جناب اسرار احمد۔ سابق صدر انجمن صحافیان پاکستان اور بشیر الاسلام عثمانی ڈٹے ہوئے تھے۔ اُن کے ساتھ وہ جیالے بھی تھے جنہوں نے انجمن کو اپنے خون سے سینچا ہے۔ کراچی سے خیبر تک صحافیوں کا ایسا عظیم اتحاد پہلے کبھی قائم نہ ہوا تھا۔

ہڑتال شروع ہونے سے پہلے مشرق کی انتظامیہ نے سب سے پہلے اور اس کے بعد مارننگ نیوز کی انتظامیہ نے انجمن کو مطلع کیا کہ وہ عامل صحافیوں کے مطالبات تسلیم کرنے کو تیار ہیں۔ اس پر غور کیا گیا تو نتیجہ یہ نکلا کہ مالکان جال میں پھنسا رہے تاکہ اے۔ پی۔ این۔ ایس (مالکان اخبارات کی انجمن) اجتماعی سوداکاری کے لیے صحافیوں کی کل پاکستان انجمن کے وجود کو سرے سے تسلیم ہی نہ کرے۔ انفرادی طور پر بعض ادارے مطالبات مان لیں۔ اور بعض نہ مانیں اور جو معاہدہ کریں وہ عمل نہ کریں اور اس طرح ہڑتال کو آغاز میں ناکام کر کے انجمن کو توڑ دیا جائے۔ اور اس کے بعد برطرفیاں شروع کر دی جائیں۔

انجمن نے ان حالات میں اپنے تمام پراونشل یونٹوں سے رپورٹ طلب کی۔ تاکہ صحیح طاقت کا اندازہ لگ سکے۔ لاہور سے مسٹر حسین نقی نے فون پر اطلاع دی کہ ندائے ملت کے علاوہ تمام ہڑتال پر ہوں گے۔ ندائے ملت میں بھی حالات بدلنے کے امکانات ہیں۔ لاہور میں عوام کی زبردست حمایت حاصل ہے۔

راولپنڈی نے مکمل ہڑتال کی ضمانت دی۔ کراچی کا نقشہ جما ہوا تھا۔ ہم نے کل پاکستان قیادت کو عملی طور پر یقین دلا دیا تھا۔ کہ "پہیہ جام" رہے گا۔ قیادت نے حالات کا ایک بار پھر جائزہ لیا اور ہڑتال پر جانے کا اعلان کرتے ہوئے واضح کر دیا کہ ہڑتال صرف اسی صورت میں ختم ہو گی جب کہ اے۔ پی۔ این۔ ایس، پی۔ ایف یو۔ جے سے معاہدہ کرے۔ اور تمام ملازمین کو عبوری امداد دے۔

دنیا کی تاریخ میں پہلی بار ملک گیر سطح پر صحافیوں کی ہڑتال ۱۵ اپریل سے پاکستان میں شروع ہوئی۔ کراچی میں واقعی "پہیہ جام" تھا۔ جنگ، مشرق، حریت ڈان، مارننگ نیوز، اے پی۔ پی اور پی پی آئی کے تمام ملازمین ہڑتال پر تھے۔ صحافتی جن سنگھی بھی شامل تھے۔ انہیں ساتھ رکھنے میں مصلحت بتائی گئی حالانکہ صحافیوں کی اکثریت ان کی تاریخی منافقت، بددیانتی اور دلالی کے پیش نظر چیخ رہی تھی کہ کالی بھیڑوں کو الگ رکھو۔ قیادت کا گھیراؤ اعتدال پسند اور آزاد خیال صحافیوں نے کر رکھا تھا۔ لہٰذا وہ ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے جس کے نتیجے میں ایک بار تو یوں ہوا کہ لاہور میں چند صحافیوں نے مولانا مودودی سے ملاقات کی۔ ادھر کراچی میں انجمن نے ایک ضمیمہ شائع کر دیا جب کہ پیپلز پارٹی اور مسٹر بھٹو کی عملی حمایت کو عام ضمیمے میں نمایاں طور پر بھی شائع نہیں کیا گیا۔

ہڑتال پورے دس دن جاری رہی۔ لاہور سے پہلے دن ہی مشرق، نوائے وقت اور ندائے ملت شائع ہوئے۔ یہاں ہڑتال صرف پاکستان ٹائمز اور امروز تک محدود رہی۔ مشرق میں تو موقع پرستی، معیشت پسندی اور جن سنگھی صحافت کے اثرات اس حد تک بڑھے ہوئے تھے کہ ہڑتالی ملازم صرف مسٹر الطاف احمد قریشی تھے۔ باقی ڈیوٹی پر آتے رہے۔ یہ تمام ضیاء الاسلام انصاری کی چیف نیوز ایڈیٹری کی کرامات تھیں۔

ہڑتال کی داستان بہت طویل ہے۔ مختصر یہ کہ صحافتی جن سنگھیوں نے جنگ کے محمود مدنی کی قیادت میں دسویں روز ہڑتال توڑی اور میر خلیل الرحمٰن سے اس کا معقول صلہ پایا۔ مشرق میں عرفان غازی، سلیم ارشد ٹولہ اپنی برادری سے غداری کا مرتکب ہوا۔ ڈان اور حریت نے، مطالبات تسلیم کر لیے۔ مارننگ نیوز کی انتظامیہ نے بھی مطالبات مان لیے۔ اے پی پی نے بھی مطالبات کی منظوری کا اعلان کر دیا۔ ان حالات میں انجمن صحافیان پاکستان نے ہڑتال ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

نیشنل پریس ٹرسٹ اور دوسرے اخبارات کی انتظامیہ نے (ماسوائے ڈان گروپ) اُن تمام صحافیوں پر روزگار کے دروازے بند کر دیئے جو اُن کے بقول کمیونسٹ تھے۔ یہ بغاوت کیسے مہنگی پڑی اس کے بارے میں ابھی تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ پورے مغربی پاکستان میں تقریباً ڈیڑھ سو عامل صحافیوں کو ملازمتوں سے برطرف کر دیا

ابنِ انشاء نے کہا "تم شوکت صدیقی کے ساتھ مل کر کیوں کام نہیں کرتے؟"

گیا۔ مشرقی پاکستان میں ایسا نہیں ہوا۔ لیکن ان صحافیوں کو اپنے بے روزگار ہونے کا کوئی غم نہیں کیونکہ ان کی قربانی سے دوسرے سینکڑوں صحافیوں کو عبوری امداد مل گئی۔ نوابزادہ شیر علی خاں، دائیں بازو کی تمام سیاسی جماعتیں، صحافتی جن سنگھی اور مالکانِ اخبارات کا متحدہ بازو اپنے منصوبے کے مطابق پہلے حملے میں کامیاب رہا تمام اخبارات پر قبضہ کر لیا۔ نیشنل پریس ٹرسٹ، جنگ، ڈان اور حریت تمام ہی جماعت اسلامی کے ترجمان بن گئے۔ اس طرح مقبوضہ اخبارات نے جنم لیا اور یہاں سے یکطرفہ صحافت کا آغاز ہوتا ہے۔

محمود شام صاحب کو اخبار جہاں سے چھٹی مل گئی۔ تھی۔ میں پہلے سے ہی باہر بیٹھا ہوا تھا۔ ایس۔ ایم۔ فضل اپنی انتظامیہ کے زبردست دباؤ کے پیشِ نظر ان حالات میں ہم سفری کے تقاضے پورے کرنے کے حق میں دکھائی نہ دیئے۔ ہمدان صاحب کا بھی یہی حال تھا۔ الفتح نکالنے کے لیے شام صاحب اور میری کوششیں رہ گئی تھیں۔ دو آدمی اور ایک ہفت روزہ اس پر یہ کہ ہمارے پاس روز کے کھانے پینے کے اخراجات تک کے پیسے نہ تھے۔ لیکن ہمیں الفتح ضرور نکالنا تھا۔ ہم شکست کے سامنے جھکنے پر آمادہ نہ تھے۔ تخمینہ اخراجات بناتے تو وہ ہر ہفتے چار پانچ ہزار سے کم نہ پڑتا۔ اس کے لیے دفتر بھی ضروری تھا۔ شام صاحب نے کہا کہ چلو اپنے ان بھائیوں سے چندہ کرتے ہیں جن کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہیں زیادہ نہیں ڈیوٹی پر چڑھنے والے پچیس روپے سالانہ کا چندہ تو دے سکتے ہیں۔ اس مہم کا آغاز ہوا۔ صرف ساڑھے تین سو روپے جمع ہو سکے۔ ان میں سے دو سو روپے ڈان کے نیوز ایڈیٹر ایم۔ جے زاہدی اور سو روپے محسن بھوپالی کے تھے۔

ہم نے صحافیوں کے علاوہ اپنے دوسرے احباب سے رجوع کیا۔ جب ابن انشاء صاحب کے پاس گئے تو انہوں نے چندہ کی بجائے مشورہ دیا کہ تم لوگ شوکت صدیقی کے ساتھ مل کر کیوں کام نہیں کرتے۔ وہ بھی تو اپنا ایک اخبار نکال رہے ہیں۔ یہی ہفت روزہ۔ شوکت اور تمہاری سوچ بھی ایک ہے اور پھر مسکرائے "ماؤزے تنگ کے پیرو کار"۔

مولانا شام نے کہا، راؤ چلو گلڈ آفس۔ گلڈ آفس پہنچے تو یہاں شوکت صاحب کے ساتھ جمیل الدین عالی اور فاروق پراچہ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے انہیں انشاء صاحب کے مشورہ سے خبردار کیا۔ شوکت صاحب آمادہ ہو گئے۔ پیسے کی بات نکلی، تو بات کچھ حوصلہ افزا ہوئی۔ اور کچھ روپیہ جمع کرنے کا وعدہ کیا گیا۔ یہ وعدہ کچھ پورا ہوا، کچھ پورا نہ ہوا۔ بہر حال ان دنوں فاروق پراچہ نے جو تعاون کیا۔ اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تعاون اگر نہ ہوتا تو شاید "الفتح" بر وقت نہ نکل پاتا۔

"الفتح" کے لیے ایک چھوٹا سا فلیٹ دفتر کے طور پر کرائے پر لے لیا گیا۔ اس عرصے میں وہاب صدیقی صاحب ہمارے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ انہیں ہڑتال سے پہلے جنگ کے شعبہ میگزین میں کام کرتے ہوئے بمشکل پندرہ دن ہوئے تھے۔ کہ ہڑتال کے بعد دوبارہ ڈیوٹی پر نہیں گئے۔ مولانا شام کے ہاں سے ایک دری آگئی تھی ہم انہیں اس پر بٹھا کر آپ باہر نکل جاتے۔ تاکہ "الفتح" کی اشاعت کا انتظام کر سکیں۔ اس وقت ہم واضح طور پر یہ فیصلہ کر چکے تھے۔

۱۔ "الفتح" ملک کے مظلوم عوام کا ترجمان ہوگا۔ سرمایہ دار، جاگیردار اور نوکر شاہی امریکی سامراج کا دشمن مزدور کسان اور طلبہ کا دوست ہوگا۔ بین الاقوامی سطح پر ہم مسلح جدوجہد کی حمایت کریں گے۔ اور پاک چین دوستی

میری ملاقات

جس کسی سے بڑھتی

اُس کی ملازمت

خطرے میں ہو جاتی

کو مضبوط بنانے میں اپنا بھرپور حصہ ادا کریں گے۔

۲۔ الفتح کو چلانے کے لیے کسی سرمایہ دار، جاگیردار یا سیاسی جماعتوں کا آلہ کار نہیں بنیں گے۔ آزاد صحافت کا علم بلند رکھیں گے۔ اصولوں پر حمایت اور مخالفت کی جائے گی۔ الفتح ذاتی مقاصد اور منفعت کے لیے استعمال کرنے سے گریز کیا جائے گا۔

۳۔ الفتح خود اعتمادی کے اصولوں پر شائع ہوگا۔

ہمارے پاس جو سرمایہ تھا۔ اس کی تفصیل پوری درج کی جا چکی ہے۔ سرمایہ دار معاشرے میں یہ پالیسی اختیار کرنیوالوں کے حشر کا آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ہمیں اصول عزیز ہے۔ اور آج بھی پہلے سے کہیں زیادہ عزیز ہیں۔ ہم نے حالات کا مقابلہ کرنے کی ٹھان رکھی ہے۔

یہ بات دوسری ہے کہ ہمارے مخالفین نے الفتح کی اشاعت سے پہلے ہی یہ پراپیگنڈہ شروع کر دیا تھا کہ یہ پرچہ شائع نہیں ہوگا۔ جن سنگھی صحافت کے شاہکار روزنامہ جسارت نے اپنی پہلی اشاعت میں ایک خبر لگا دی کہ احمد ندیم قاسمی اور شوکت صدیقی کی نگرانی میں شائع ہونے والے اشتراکی ہفت روزہ "الفتح" کی اشاعت نہیں ہوگی۔ کیونکہ الفتح کے لیے جو کھالیں جمع کی گئی تھیں اس کا چندہ پیپلز پارٹی کے ایک رہنما نے ہڑپ کر لیا ہے۔ اندازہ لگائیے کہ چندہ فلسطینی مجاہدین کی تنظیم الفتح کے نام پر پیپلز پارٹی والوں نے جمع کیا ہوگا اسے ہفت روزہ الفتح سے ملا دیا گیا۔ کتنی گھٹیا صحافت کا نمونہ ہے۔

دراصل بات یہ تھی کہ مالکان اخبارات جن سنگھیوں اور ان کے آقاؤں کو یقین ہو گیا تھا کہ الفتح وقت پر نکلے گا۔ انہوں نے اس کی اشاعت روکنے کے لیے بھاگ دوڑ شروع کی۔ پروگرام کے مطابق اسے ملت پریس میں چھپنا تھا۔ انقلاب ماتری صاحب سے معاملہ طے ہو چکا تھا۔ ہم کاپیاں لے کر پریس پہنچے تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگے۔ "یہ پرچہ ہم شائع نہیں کر سکتے۔ آپ کسی اور پریس میں چھپوا لیں۔" یہ واقعہ ۱۹ مئی ۷۰ء کو پیش آیا۔ ۲۲ مئی ۷۰ء کو ڈیکلریشن کی میعاد ختم ہو رہی تھی۔ اس آڑے وقت میں جمیل الدین عالی کام آئے۔ انہوں نے انجمن پریس میں اشاعت کا انتظام کروا دیا۔ اور الفتح ۲۱ مئی ۷۰ء کو اپنے اس عظیم دور میں داخل ہوا۔ جس کے سرورق پر لکھا ہوا ہے۔ "سامراجیو ایشیا سے بھاگ جاؤ"۔

اخباری وڈیروں کی آنکھ میں الفتح کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ ہم اس کی نوک تیز کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ وڈیروں کے اخبارات مکمل طور پر مقبوضہ تھے۔ میر خلیل الرحمٰن کے پرچے پر یوسف صدیقی اور محمود مدنی کی حکومت تھی۔ میر صاحب بالکل "ڈمی" بنے ہوئے تھے۔ یار لوگوں نے ایک بار تو یہاں تک اڑا دی کہ میر خلیل



جب وزیرِ اطلاعات نے اخبارات پر قبضہ کر کے نپولین بننا چاہا

الرحمان آج کل یوسف صدیقی کے ماتحت ملازمت کر رہے ہیں۔ یوسف صدیقی کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔ اور پانچ ہزار روپے ماہوار وصول کرتے ہیں۔ یہ سودا صرف انتخابات تک ہوا ہے۔ جماعت اسلامی جیت گئی تو میر صاحب کی ملازمت مستقل ہو جائے گی ورنہ دیکھا جائے گا۔

نوابزادہ شبیر علیخان انتخابات کے دوران ڈیکلریشن منسوخ کرنے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ پرچہ بند ہو جائے۔ میر صاحب اُن کی اس خواہش کی تکمیل میں پیش پیش تھے۔ وہ انجمن پریس کے ٹرسٹی مقرر ہو گئے تھے۔ چنانچہ جمیل الدین عالی صاحب کو میر خلیل الرحمان کے حکم کے سامنے جھکنا پڑا اور انجمن پریس نے الفتح شائع کرنے سے انکار کر دیا۔

پھر پریس کی دشواریاں سامنے آئیں۔ ہمیں لیاقت آباد میں ایک آفسٹ پریس مل گیا۔ اس کا نام حفی آفسٹ پریس ہے۔ آج کل بھی الفتح یہیں شائع ہوتا ہے۔ یہ پریس بھی دباؤ اور ناجائز ہتھکنڈوں سے محفوظ نہ رہا۔ ایک بار میں دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے اطلاع دی گئی کہ پریس پر پولیس نے چھاپہ مارا ہے اور الفتح کے کچھ فرمے اٹھا کر لے گئی ہے۔ میں نے ڈپٹی کمشنر جناب کنور اویس سے رابطہ قائم کیا۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے کوئی آرڈر نہیں دیا ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ ڈی۔ آئی۔ جی سے بات کرتا ہوں۔ پتہ چلا کہ اسپیشل پولیس والے تھے اور انہیں ہمارے ایک مہربان افسر نے ہدایت کی تھی کہ وہ یہ فرض ادا کریں۔

الفتح کو بند کرانے، اس کے کارکنوں کو ہراساں کرنے اور مختلف مقدمات میں ملوث کرنے کی داستان

ہم اپنی بساط کے مطابق
ایک ذہن تیار کر رہے ہیں
جو یقیناً ہر مقبوضہ شے
کو آزاد کرائے گا۔

کا اس لیے ذکر نہیں کر رہا کہ اس کی اشاعت سے آبگینوں کو ٹھیس لگ جائے گی۔ اور نقصان الفتح کا ہوگا۔ شاید یہ بند کر دیا جائے۔ اور اس کے خلاف اپیل بھی نہ ہو۔ ہمیشہ حالات ایک سے نہیں رہتے۔ الفتح پر کی جانے والی زیادتیاں اور مجھے پہنچائی جانے والی اذیتیں پاکستان کی صحافت کی تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔ آج نہیں تو کل ان کا تذکرہ ہوگا۔ تاہم میں اس سلسلے میں پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین جناب ذوالفقار علی بھٹو کا ممنون ہوں کہ انہوں نے ایسے کٹھن حالات میں بھرپور مدد کی۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہر بار جیل کی سلاخوں سے باہر رہ کر قارئین الفتح کی مقدور بھر خدمت کا موقع ملتا رہا۔

ان اقدامات سے ہمارے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ ہم آزادئ صحافت کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ الفتح نے عام انتخابات کے دوران جس نظریئے کا پرچار کیا، اُسے اس میں توقع سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ سندھ میں عوام دوست طاقتوں کا بالعموم اور پورے پاکستان میں بالخصوص یہ واحد ہفت روزہ ہے جسے عامل صحافی اپنی مدد آپ کے تحت چلا رہے ہیں۔ کراچی سے اس کے مقابلے میں اردو اخبارات کا دیو جنگ (سب سے زیادہ اشاعت) حریت، مشرق جماعتِ اسلامی کا جسارت، ڈان اور دوسرے اخبارات روزانہ شائع ہوتے ہیں۔ انہوں نے عام انتخابات کے دوران خاص طور پر جانبداری سے کام لیا۔ اور عوام کو گمراہ کرنے اور عوام دوست طاقتوں کے خلاف زہر اُگلنے کی مہم جاری رکھی۔ روزانہ ان کے صفحات کفر کے فتاوے، جماعت اسلامی، پی۔ ڈی۔ پی کے بیانات سے اٹے ہوئے تھے۔ ہفتے کے بعد الفتح نکلتا تھا۔ اور ان کا اگلا پچھلا جادو دھرا کا دھرا رہ جاتا تھا۔ ہم نے ان کا بہت دور دور تک پیچھا کیا اور اب بھی کر رہے ہیں اور انہیں بلوں میں ٹھکانے لگا کے رہیں گے مقبوضہ صحافت کے خلاف ہماری جدوجہد اس وقت تک جاری رہے گی۔ جب تک آزاد صحافت کا بول بالا نہیں ہوتا۔ اخبارات کو نپولین اور اُس کے چیلوں سے نجات نہیں مل جاتی۔

یہ کام بہت کٹھن ہے۔ چند افراد اسے انجام نہیں دے سکتے۔ اس فریضے کی ادائیگی کا ٹھیکہ اور اجارہ داری کسی ایک کے سپرد بھی نہیں۔ ہم اپنی بساط کے مطابق ایک ذہن تیار کر رہے ہیں جو یقیناً ہر مقبوضہ شے کو آزاد کرائے گا۔ فتح اُسی کا مقدر ہے۔



کاروانِ صحافت ——— کراچی کی سڑکوں پر

۲۲۔ خاندان —— کون کیا ہے ؟

اس بار ہلکا سا تعارف ۔ تفصیل آئندہ

الفتح رپورٹ

راہ چلتے، اگر کسی غیر سیاسی، عام آدمی سے
وال کیا جائے، ہمارے ملک میں معاشی بحران کیوں
ہے؟ تو وہ اس کا سیدھا اور صاف جواب دے گا
ے بڑے سرمایہ داروں کی وجہ سے۔ ملک کے
۲ خاندان ذمہ دار ہیں۔ پاکستان کی ساری دولت
کر بیٹھ گئے ہیں۔"

جی ہاں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے، اس ملک
بڑھتے ہوئے سیاسی اور سماجی مسائل کی وجہ
عوامی سطح پر ایک شدید ردعمل کا اظہار کیا جا رہا
۔ اس کی بڑی وجہ ارتکاز دولت اور ۲۲ سرمایہ دار
انوں میں وسائل پیداوار کا چلا جانا ہے سرمایہ داروں
تعداد میں اختلاف ہو سکتا ہے، مگر اصل مسئلہ تعداد
ں ہے، اگر ۲۰ خاندان ہوئے تو کیا آخر ۲۰ بھی تو
ہی کا حصہ ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ملک کی
ذرائع پیداوار اسی سرمایہ دار طبقہ کے قبضے
ہے۔

کراچی اسٹاک ایکسچینج کے مطابق بڑے سرمایہ دار
ادارے پورے ملک کی معیشت پر کنٹرول کرتے
۔ ان کے کوائف سے آگاہی کے دو طریقے ہیں
کی مندرج کمپنیوں میں لگے ہوئے سرمایہ کا اندازہ
جائے، دوم، ان کی موجودہ جائدادوں کی قدر و
ت دیکھی جائے۔ کراچی اسٹاک ایکسچینج میں ان کی مندرج
ہ کمپنیوں کی سرمایہ کاری کے مطابق پاکستان کے
ب ذیل کاروباری گروپ بالترتیب مقام حاصل
ہوئے ہیں۔

۲۲۔ بڑے سرمایہ دار گروپ

		مندرج کمپنیاں	لگا ہوا سرمایہ کروڑ میں
۱	داود	۷	۱۹
۲	سہگل	۳	۱۶
۳	آدم جی	۵	۱۵
۴	حبیب	۵	۱۰
۵	کرسینٹ	۴	۹
۶	ولیکا	۷	۹
۷	آمین	۷	۹
۸	باوانی	۶	۷
۹	کالونی (نصیرا)	۴	۷
۱۰	بیکو	۱	۵
۱۱	فینسی	۵	۵
۱۲	مولابخش	۵	۵
۱۳	حسین	۲	۴
۱۴	کالونی (فاروق)	۳	۳
۱۵	حئی سنز	۲	۳
۱۶	وزیر علی	۲	۳
۱۷	نشاط	۳	۳
۱۸	گندھارا	۳	۳
۱۹	اصفہانی	۲	۳
۲۰	ظفر الاحسن	۴	۲
۲۱	فتح	۲	۲
۲۲	دادا	۱	۲
		۸۵	۱۱۴

کراچی اسٹاک ایکسچینج میں جتنی کمپنیوں کے نام درج ہیں۔ ان کے مجموعی سرمایہ میں سے ۴۳ فی صد سرمایہ انہی ۲۲ خاندانوں کا ہے جو ان کی کمپنیوں میں لگا ہوا ہے۔ اگر ان کے لگے ہوئے سرمایہ کے اعداد و شمار کو ان کی موجودہ، جائدادوں میں شامل کر دیا جائے تو پاکستان کی معیشت پر ان کے قبضے کی داستان اور بھی لرزہ خیز ہو جاتی ہے۔

داؤد

پاکستان میں داؤد کا وہی مقام ہے جو بھارت میں ٹاٹا کا ہے۔ ان کی سات کمپنیاں، کراچی اسٹاک ایکسچینج میں مندرج ہیں جس میں لگایا ہوا۔ سرمایہ ۱۹ کروڑ بتایا جاتا ہے۔ ان کا ایک دوسرا منصوبہ، داؤد ہرکولیس کیمیاوی پروجیکٹ، ابھی شروع نہیں ہوا۔ اس منصوبے کا کل سرمایہ ۴۳ کروڑ بتایا گیا ہے۔ اس منصوبے کے شروع ہونے کے بعد داؤد کا کوئی ثانی نہ ہوگا۔ تقسیم سے قبل بمبئی میں یہ خاندان سوت کا معمولی ڈیلر تھا۔

اب اس خاندان کی حسب ذیل کمپنیاں چلتی ہیں

۱۔ داؤد کاٹن ملز
۲ بری والا ٹیکسٹائل ملز
۳۔ کرنافلی پیپر ملز
۴ سنٹرل انشورنس کمپنی
۵ لارنس پور وولن ملز
۶۔ کرنافلی ریان ملز
۷۔ داؤد پٹرولیم

سہگل

سہگل کو اگر پاکستان کا برلا کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ دوسرے نمبر کے بڑے سیٹھ ہیں۔ تقسیم سے پہلے، کلکتہ میں اس خاندان کے پاس ربر کا ایک چھوٹا سا کارخانہ تھا جنگ کے دوران، داؤد خاندان کی طرح اس خاندان نے بھی دولت جمع کی۔ ۱۹۶۰ء میں سرمایہ دار طبقہ میں اس کی تیسری پوزیشن تھی، ۱۹۶۵ء میں اس نے پہلا مقام حاصل کیا۔ اور ۱۹۶۹ء میں دوسری پوزیشن پر آگیا۔

پاکستان میں اس خاندان کی تین کمپنیاں ہیں جن میں لگایا ہوا سرمایہ ۱۶ کروڑ ہے۔

۱۔ کوہ نور انڈسٹریز
۲ یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ
۳ کوہ نور ریان لمیٹڈ

آدم جی

پاکستان کے بڑے تاجر طبقہ کی چودھراہٹ میں آدم جی کا تیسرا مقام ہے داؤد اور سہگل کے بعد، ۱۹۵۵ء اور ۱۹۶۰ء میں آدم جی پہلے نمبر پر تھے مگر ۱۹۶۵ء میں سہگل نے ان کی چودھراہٹ کا خاتمہ کر کے وہ مقام خود حاصل

داؤد —— ہمارا ٹاٹا، سہگل، ہمارا برلا

کر لیا۔ ۱۹۶۹ء میں داؤد خاندان سہگل اور آدم جی سے بازی لے گیا۔ آدم جی برما میں کاروبار کرتے تھے، جنگ دوم سے پہلے ان کا کاروبار برما سے کلکتہ منتقل ہوگیا کیونکہ چھوٹا سا برما ان کی کاروباری اُڑان کی وسعت سے تنگ تھا۔ جنگ کے دوران خاندان نے جوٹ کی تجارت سے خوب دولت کمائی ہے۔

پاکستان میں اس خاندان کے پاس مندرجہ ذیل کمپنیاں ہیں۔

۱۔ مسلم کمرشل بنک لمیٹڈ
۲ آدم جی جوٹ ملز
۳ آدم جی انڈسٹریز لمیٹڈ
۴ آدم جی انشورنس کمپنی لمیٹڈ
۵ آدم جی شوگر ملز لمیٹڈ۔

(اللہ دے، بندہ لے) یہ خاندان اس پر صدق دل سے عمل کرتا ہے۔

حبیب

۸ بڑے سرمایہ داروں کی ریس میں حبیب کی پوزیشن چوتھی ہے۔ تقسیم سے پہلے حبیب خاندان بمبئی میں سونے کا تاجر تھا۔ بنک کا کاروبار شروع کرنے کے بعد بھی اس خاندان نے اپنا موروثی پیشہ جاری رکھا لیکن بنک کا کاروبار اس خاندان کو اتنا راس آیا کہ موروثی پیشے کو ترک کرنا پڑا۔

تقسیم کے بعد یہ خاندان اپنا تھوڑا سا سرمایہ لے کر پاکستان چلا آیا۔ اب اس کے پاس ۵ بڑی کمپنیاں ہیں

۱ حبیب بنک لمیٹڈ
۲ حبیب انشورنس کمپنی
۳ حیدری کنسٹرکشن
۴ حبیب شوگر
۵ علی اصغر ٹکسٹائل ملز

کریسنٹ

کریسنٹ کی پانچویں پوزیشن ہے۔ ۱۹۶۵ء میں یہ چوتھے نمبر پر آگیا تھا۔ تقسیم سے پہلے کریسنٹ خاندان بھارت میں چمڑے کا بہت معمولی کاروبار کرتا تھا۔ یہ خاندان جب پاکستان میں آیا تو اس کے پاس چند ہزار یا زیادہ سے زیادہ چند لاکھ روپے کا بہت حقیر سا سرمایہ تھا۔ اب اس خاندان کی صرف چار کمپنیوں میں جاری سرمایہ ۹ کروڑ روپے ہیں۔

۱ پریمیر انشورنس
۲ کریسنٹ ٹیکسٹائل ملز
۳ کریسنٹ شوگر
۴ کریسنٹ جوٹ

۱۹۵۵ء میں اس کا خاندان کا کسی کمپنی میں سرمایہ نہیں لگا تھا۔

۱۹۶۰ء میں ایک کروڑ روپیہ
۱۹۶۵ء میں ۸ کروڑ روپیہ
۱۹۶۹ء میں ۹ کروڑ روپیہ

کریسنٹ کی اس ترقی کو اسی کی فیکٹری یا کمپنی میں کام کرنے والے مزدور یا کلرک کی ترقی سے ہرگز نہ ملائیے۔ مایوسی ہوگی۔

ولیکا

داؤد، سہگل، آدم جی اور حبیب کے مقابلہ میں ولیکا کم حیثیت ہے آزادی سے قبل ولیکا خاندان بمبئی کے اطراف میں پولیس کی ملازمت دکانداری اور چھوٹے موٹے کاروبار پر گذر بسر کرتا تھا۔ پاکستان میں آنے کے بعد اس خاندان نے اپنا مختصر سا سرمایہ کاروبار میں لگا دیا، کچھ حبیب بنک والوں نے مدد کی۔ بس پھر کیا تھا مینہ برسا اور چھپّر پھاڑ کر برسا۔

اب اس خاندان کے پاس یہ کمپنیاں اور ملز ہیں

۱۔ ولیکا ٹیکسٹائل ملز
۲ ولیکا وولن
۳ ولیکا آرٹ فیبرکس
۴ محمدی اسٹیم شپ
۵ ولیکا سیمنٹ
۶ ولیکا کیمیکلز
۷ یونائیٹڈ انشورنس

آمین

کریسنٹ، ولیکا اور آمین کے درمیان بہت تھوڑا سا فرق ہے۔ تقسیم سے پہلے یہ خاندان کلکتہ میں چمڑے کا معمولی کاروبار کرتا تھا۔ اس گروپ کی اہم شخصیت اے جلیل۔ آمین کاروبار قائم کرنے والے کے بھتیجے ہیں، تقسیم کے بعد یہ خاندان مشرقی پاکستان چلا گیا اور وہاں جوٹ کا کاروبار شروع کر دیا۔ اس خاندان نے سب سے پہلے پاک جوٹ بیلرز اور آمین جوٹ ملز کا کاروبار شروع کیا۔ ابتدا میں انہیں کچھ زیادہ کامیابی نہ ہوئی مگر ۱۹۵۵ء میں اس خاندان نے صنعتی میدان میں فروغ حاصل کرنا شروع کیا ۱۹۵۵ء میں اس کی پوزیشن پانچویں تھی، پھر ۱۹۶۰ء میں یہ نواں خاندان تھا۔ ۱۹۶۹ء میں ساتویں نمبر پہ آگیا۔

۱ پاک جوٹ بیلرز
۲ امین جوٹ ملز
۳ امین ٹیکسٹائل ملز
۴ پاکستان نیشنل آئل
۵ ایسکو کولڈ اسٹوریج
۶ نیشنل ریفائنری
۷ آمین فیبرکس

(۸) باوانی۔

۲۲ خاندان میں باوانی آٹھویں نمبر پر ہے تقسیم سے پہلے یہ خاندان برما میں کپڑے کا کاروبار کرتا تھا۔ پاکستان میں بھی اسی صنعت کے سہارے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا ہے۔ ۱۹۴۹ء میں باوانی وولن کاٹن ٹکسٹائل ملز، اس خاندان کا پہلا صنعتی کارنامہ ہے۔ اس کے بعد تو کارناموں کے ڈھیر لگ گئے۔

کراچی اسٹاک ایکسچینج میں درج شدہ کمپنیوں کے مطابق اسی خاندان کی حسب ذیل کمپنیاں ہیں۔

(۱) باوانی وولن ٹکسٹائل ملز لمیٹڈ
(۲) لطیف باوانی جوٹ ملز
(۳) احمد باوانی ٹکسٹائل لمیٹڈ
(۴) باوانی شوگر ملز لمیٹڈ
(۵) آر، آر ٹکسٹائل لمیٹڈ
(۶) آر، آر، جوٹ

اسلام پسند ہیں۔ مسلم انٹرنیشنل ان کا پرچہ ہے۔

(۹) کالونی (نصیر)

چند سال قبل کاروباری طبقے میں کالونی ایک طاقت ور گروپ تھا۔ لیکن خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے اس گروپ کا شیرازہ منتشر ہوگیا اور تین مختلف گروپوں میں بٹ گیا۔

اس خاندان کے پاس مندرجہ ذیل کمپنیاں ہیں

(۱) کالونی ٹکسٹائل ملز لمیٹڈ
(۲) اسمٰعیل سیمنٹ لمیٹڈ
(۳) نیشنل سیکورٹی انشورنس
(۴) ملتان الیکٹرک

"قلم مزدوروں" کے استحصال کا شوق پورا کرنے کے لئے ایک خاندان نے اخبار نکالا

یہ گروپ کاروباری معاملات میں بے حد اسمارٹ ہے۔

(۱۰) **بیکو**

اجارہ دار سرمایہ دار گروپ میں اس کا مقام دسواں اور پنجاب کے سب گروپوں میں اس کی پوزیشن پانچویں ہے۔ ۱۹۵۵ء میں یہ خاندان آٹھویں نمبر پر تھا۔

بٹالہ انجینئرنگ کمپنی، اسی خاندان کے پاس ہے۔

(۱۱) **فینسی**

فینسی گروپ پاکستان کی صنعتی دوڑ میں دیر سے شامل ہوا۔ پھر بھی اس کا مقام گیارہواں ہے۔ اگر اس کے جاری شدہ سرمایہ اور جائدادوں کو شامل کرلیا جائے تو بڑے سرمایہ داروں میں اس کی پوزیشن چوتھی ہوگی۔

اس خاندان کے پاس ان دنوں یہ کمپنیاں ہیں

(۱) نیو جوبلی انشورنس کمپنی

(۲) کراچی گیس کمپنی

(۳) اسٹیل کارپوریشن آف پاکستان

(۴) کامرس بنک لمٹیڈ

(۵) پاک کروم مائنز

یہ خاندان بڑی تیزی سے مختلف اداروں پر چھا رہا ہے۔ پاکستان ٹورزم ڈیولپمنٹ کارپوریشن پر انہوں نے بغیر کسی پیسے کے قبضہ کرلیا ہے۔ اپنی ایڈورٹائزنگ فرم ہے۔ ایشیاٹک۔ اسماعیلی ہونے کے ناطے سے تمام اسماعیلی کمپنیوں کے اشتہارات اپنی کمپنی میں لیے جارہے ہیں۔ اس صنعت پر بھی اجارہ داری قائم کررہے ہیں۔

(۱۲) **مولا بخش**

اس خاندان کا نمبر بارہواں ہے۔ پنجاب کے ابھرتے ہوئے سرمایہ دار گروپ میں اس کا چھٹا نمبر ہے کراچی اسٹاک اکسچینج میں اس گروپ کی پہلی کمپنی کا نام ۱۹۶۵ء میں درج کیا گیا۔ اس گروپ نے یونائٹیڈ جوٹ میں ایک لاکھ ۵۰ ہزار سے اپنا کاروبار شروع کیا۔ اب اس کے پاس۔

(۱) یونائیٹڈ جوٹ

(۲) میگھنا جوٹ

(۳) چاندپور جوٹ

(۴) بخش ٹیکسٹائل

(۵) الوار ٹکسٹائل ہیں۔

(۱۳) **حسین**

شروع میں یہ گروپ ٹکسٹائل انڈسٹریز میں دلچسپی لیتا تھا۔ چند سالوں کے بعد چٹاگانگ میں اسٹیل ٹیوب پلانٹ، تعمیر کیا گیا۔ ۱۹۶۷ء میں اس گروپ نے ایک شوگر ملز بھی قائم کرلی۔

اس گروپ کے پاس یہ کمپنیاں ہیں۔

(۱) حسین انڈسٹریز لمٹیڈ

(۲) حسین شوگر ملز

(۱۴) **کالونی** (فاروق)

اس گروپ کا مقام چودھواں ہے۔ پنجاب کے سرمایہ دار گروپ میں ساتویں نمبر پر ہے۔ اس کے پاس اسٹریلیشیا بنک، پاکستان سیمنٹ انڈسٹری اور کالونی سرحد ٹکسٹائل ملز ہے۔

(۱۵) **حبی سنز**

۲۲ بڑے سرمایہ دار طبقہ میں پندرھویں نمبر پر آنے والے حبی سنز گروپ کی صحیح دولت کا اندازہ "پیٹاپ"، سرمایہ سے لگانا مشکل ہے۔ اس گروپ کے پاس حبی سنز شوگر ملز، فیک ٹرکس ہے۔ حبی سنز سٹیل ملز کا منصوبہ زیر غور ہے۔ ۲۲ خاندانوں کی لمبی دوڑ میں ابھی یہ گروپ پیچھے ہے۔

(۱۶) **وزیر علی**

وزیر علی اجارہ دار سرمایہ دار گروپ میں سولھویں نمبر پر ہیں۔ اور پنجاب کے ابھرتے ہوئے سرمایہ دار طبقہ میں آٹھویں پوزیشن رکھتے ہیں۔ اس کے پاس وزیر علی انڈسٹریز اور بیکرز لمٹیڈ ہے۔ یہ گروپ شروع سے پرائیویٹ کمپنیوں میں دلچسپی لیتا رہا۔ اس گروپ کے پاکستان کی نوکر شاہی میں خاصے نمائندے رہے مسٹر امجد علی مرکزی وزیر مالیات بھی رہ چکے ہیں اور اقوام متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی کے فرائض بھی ادا کرچکے ہیں۔

(۱۷) **نشاط**

پاکستان کے ۲۲ خاندان میں اس گروپ کا نمبر سترھواں ہے۔ جب کہ پنجاب کے ابھرتے ہوئے سرمایہ داروں میں اسے نویں پوزیشن حاصل ہے۔ اس کے پاس نشاط ملز، نشاط انڈسٹریز، کیمیکلز انڈسٹریز آف پاکستان، ٹاٹگیل ٹکسٹائل، اور یونین انشورنس کمپنی ہے۔

(۱۸) **گندھارا**

اٹھارھویں نمبر پر گندھارا خم ٹھونک کر کھڑا ہے یہ سرحد کا ابھرتا ہوا سرمایہ دار طبقہ ہے۔ نوکر شاہی اور بعض سیاستدان اس کے پشت پناہ ہیں۔ اس کے مینجنگ ڈائریکٹر کیپٹن گوہر ایوب تھے۔ اب اس صنعت کی اہم شخصیت گوہر ایوب کے خسر لیفٹیننٹ جنرل حبیب اللہ خان ہیں۔ اس گروپ کے پاس گندھارا انڈسٹریز جاناں دی ملوکو ٹکسٹائل ملز، اور گلفارا حبیب ہیں۔

(۱۹) **اصفہانی**

پاکستان کے بڑے تاجر گروپ میں اصفہانی انیسویں نمبر پر ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں اس کا نمبر آٹھواں تھا۔ ۱۹۶۰ء میں دسواں اور ۱۹۶۵ء میں ۷ واں ہوگیا۔ اس گروپ کے کاروبار کا جال مشرقی پاکستان میں پھیلا ہوا ہے۔ اصفہانی مشرقی پاکستان سے تعلق نہیں رکھتے۔ تقسیم سے قبل یہ گروپ جوٹ کا کاروبار کرتا تھا۔ اور کچھ چائے کے باغات تھے۔ چٹاگانگ اور ڈھاکہ میں اصفہانی کی بڑی بڑی جائدادیں ہیں۔ کراچی اسٹاک اکسچینج میں ان کی دو کمپنیوں کے نام درج ہیں۔

(۱) وکٹری جوٹ

(۲) چٹاگانگ جوٹ

سوشلسٹ ہونے کے دعویدار ہیں۔ خدا اسٹیلز پر رحم کرے۔

باقی صفحہ ۹۸ پر ملاحظہ فرمائیں

بخارا کے قالین

دنیا بھر میں مکمل اعتماد
کے ساتھ خریدے اور
استعمال کیے جاتے
ہیں

وادیٔ سندھ
پانچ ہزار برس سے تہذیب و تمدن
کا گہوارہ رہی ہے۔ اس نے فنون
لطیفہ کو جنم دیا اور ان کو پروان چڑھایا۔
آج کل یہی وادیٔ سندھ پوری دنیا میں بہترین قالین
بافی کے لئے مشہور ہے اور بخارا ایلیس لمیٹڈ کے تیار کردہ قالین ہر جگہ
سرفہرست شمار ہوتے ہیں۔ **بخارا قالین**، روایتی ڈیزائنوں، چمک
دمک، پائیداری اور حسن آرائش کی وجہ سے دنیا بھر میں فن لطیف اور جدید طرز
زندگی کے شائقین کی نگاہوں کا مرکز بنے ہوتے ہیں۔



بخارا ایلیس لمیٹڈ زیب النساء اسٹریٹ (سابقہ الفنسٹن اسٹریٹ) صدر کراچی ۳
برانچ: ۵۴ ۔ دی ۔ مال ۔ لاہور

NATIONAL 69 G

افسانہ

تمغہ

بیٹا حلال کی
روزی کھانا

شمشاد احمد

انکم ٹیکس جیسے محکمے میں دس برس تک ملازمت کرنے کے باوجود حامد علی نے آج تک رشوت نہ لی تھی۔ اس کی گھسی پٹی شیروانی اور گنجی جناح کیپ سے لے کر زردچھالیہ والی پٹاری کے ٹوٹے، بکھرے دھاگے تک اس بات کے گواہ تھے جو کوئی سنتا تعجب کرتا کہ اس دور میں جب کہ انسان اخلاقی قدروں کی چولی اتار کر بالکل ننگا ہو چکا ہے یہ شخص اتنا دبیز لحاف اوڑھے بیٹھا ہے۔ اس کا دم بھی نہیں گھٹتا!!

اگر ماہوار تنخواہ ڈھائی تین ہزار ہو تو انسان اصولوں کے چاؤ چونچلے بھی اٹھالے لیکن دو سو روپلی پانیوالے کلرک کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس عیاشی کا ذوق رکھے؟

دفتر کے سب ساتھی اسے بے وقوف، ادرسکی سمجھتے اور تفریح طبع کے لئے اس پر اکثر پھبتیاں کستے رہتے۔ لیکن حامد علی دنیا و مافیہا سے بے خبر و بیزار، کرم خوردہ رجسٹروں کی اوٹ میں اپنی دنیا بسائے ٹامک ٹوئیاں مارتا رہتا۔

کبھی کبھی کسی پاس بیٹھے ساتھی کو احساس ہوتا کہ آج حامد علی کے ماتھے کی جھرّیاں زیادہ گہری ہیں۔ اس کا چہرہ رجسٹر سے صرف چار انچ اونچا ہے اور زردے چھالیہ والی پٹاری سے صرف چھالیہ برآمد ہو رہی ہیں تو اس کی رگِ ہمدردی پھڑک اٹھتی۔

وہ اپنے قیمتی سوٹ کی کریز کا خیال رکھتے ہوئے حامد علی کو شانے سے ہلاتا۔ حامد علی یوں چونکتا جیسے اچانک زمین کی گردش رک گئی ہے اور وہ شدید جھٹکے سے کسی اور سیارے پر آگرا ہے۔

"حامد علی صاحب اپنی حالت سدھاریئے۔ آپ نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟"، حامد علی کے چہرے پر ایک الجھی ہوئی مسکراہٹ ابھرتی اور وہ بے بسی سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے شہادت کی انگلی اٹھا دیتا۔

"سب اس کے ہاتھ میں ہے"،

اور نصیحت کرنے والے کا جی چاہتا کہ وہ خودکشی کرلے یا کم از کم دیوار سے سر ہی پھوڑ دے۔

حامد علی عموماً خاموش رہتا۔ وہ کس کی بات میں دخل نہ دیتا تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ وہ گونگا بہرا یا اندھا ہے۔ وہ سب سمجھتا تھا کہ اس کے ساتھی اتنے نئے نئے سوٹ اور ٹائیاں کیسے خریدتے ہیں؟ ریس پر ہارنے کے لئے رقم کہاں سے آتی ہے؟ اور بیوی بچوں کو پہاڑ پر بھیجنے کا خرچہ کیونکر بنتا ہے؟

وہ ہر گر سے واقف تھا اگر چاہتا تو اپنی بوسیدہ جھگی کو دنوں میں ایک خوبصورت بنگلے میں بدل سکتا تھا اس کی ڈھچری سائیکل کی جگہ نئی گاڑی بھی آسکتی تھی اور اس کا بچہ کوڑے کے ڈھیر سے اٹھائے ہوئے گلیکسو اور فیریکس کے ڈبوں سے کھیلنے کی بجائے انہیں استعمال بھی کر سکتا تھا۔ لیکن — اور یہ لیکن اس کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ تھا۔ کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا کہ یہ "لیکن" سرے سے پھٹی ہوئی بانس کی چھڑی ہے، جس کے اندر وہ پھنس کر رہ گیا ہے۔

حامد علی کے باپ نے دم دینے سے ذرا پہلے اسے اشارے سے قریب بلایا تو چاروں طرف بیٹھے لوگوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔

"کسی خزانے کا راز بتائے گا"

"بنک میں پیسہ جمع ہو گا"

"ماں کا خیال رکھنے کو کہے گا"

حامد علی آنسو پونچھتا ہوا باپ کے پاس آیا اور جھک کر اپنا کان اس کے منہ سے لگا دیا باپ نے رکتے رکتے اس کے کان میں ایک جملہ پھونکا — اور بات ابھی پوری بھی نہ ہو پائی تھی کہ حامد علی دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

لوگوں نے لاکھ تسلی دی لیکن حامد علی کے آنسو نہ رکے۔ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی اور اسی دوران اس کے باپ نے دم دے دیا۔ حامد علی کھویا کھویا سا کفن دفن کے انتظام میں لگ گیا۔

جب جنازہ قبر میں اتارا جانے لگا تو حامد علی ایک بار پھر دھاڑیں مار کر رونے لگا پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ روتا پیٹتا دیوانوں کی طرح سرپٹ دوڑتا ہوا گاؤں کی طرف بھاگ نکلا۔

پھر سرگوشیاں ہوئیں۔

"بے چارہ باپ کا غم نہ سہہ سکا"

"دماغ چل گیا ہے"

آہستہ آہستہ سرگوشیاں کھلم کھلا گفتگو میں بدلنے لگیں۔ کسی نے مشورہ دیا کہ لاش سپرد خاک کر دی جائے کسی کی رائے تھی کہ دو چار آدمی بھجوا کر حامد علی کو بلوایا جائے اور جب تک وہ نہ آئے لاش کو قبر میں نہ اتارا جائے۔

مولوی صاحب نے لاش کی کمر میں ڈالی ہوئی چادر نکال لی۔ اور ایک طرف ہٹ کر درخت کے سائے میں آبیٹھے۔ لوگ باگ تھوڑی دیر انتظار کرتے رہے پھر ادھر ادھر کھسک لئے تاکہ بیڑی پان کا سلسلہ چل سکے۔

پانچ منٹ، دس منٹ حتیٰ کہ گھنٹے بھر سے بھی زیادہ ہو گیا لیکن حامد علی کا کوئی پتہ نہ تھا۔ آخر لوگوں کا صبر کا پیمانہ لبریز ہوتے لگا اور متفقہ طور پر طے پایا کہ اب حامد علی کا انتظار بے کار ہے مولوی صاحب نے ایک بار پھر سفید لٹھے کی چادر میت کی کمر کے نیچے سرکائی اور ابھی اشھدُ لا اللہ کا ورد شروع ہی ہوا تھا کہ ایک طرف سے تیز آواز آئی۔

"آگیا — حامد علی آگیا!"

سب نظریں قبرستان کی طرف آنے والی پگ ڈنڈی کی طرف اٹھ گئیں۔ دور مرگھٹ کے موڑ کے پاس حامد علی بگولے کی طرح اڑا آرہا تھا۔ جب وہ ہجوم کے قریب پہنچا تو ہر کسی نے دیکھا

الفتح کراچی

کہ حامد علی کے ہاتھ میں لکڑی کی ایک سیاہ تختی ہے جسے وہ دونوں ہاتھوں میں تھامے چیختا آ رہا ہے۔

"رک جاؤ۔۔۔ رک جاؤ"

وہ ہجوم کو چیرتا ہوا میت کے پاس آ کھڑا ہوا اور پھر اچانک جھک کر وہ تختی باپ کی مردہ آنکھوں کے سامنے کر دی۔ پاس کھڑے لوگوں نے دیکھا کہ اس سیاہ تختی پر سفید حروف میں لکھا تھا۔

"بیٹا۔ ہمیشہ حلال رزق کھانا"

تختی پر روغن ابھی گیلا تھا لیکن پھر بھی حروف کی سفیدی سیاہ پس منظر میں بڑی نمایاں تھی۔

اس کے بعد حامد علی کی حالت بالکل ٹھیک ہو گئی۔ اس کے چہرے پر سے پاگل پن کے آثار یک لخت معدوم ہو گئے اور وہ بڑی سنجیدہ آواز میں مولانا سے مخاطب ہوا۔

"بسم اللہ کیجئے۔ مولانا"

گھر پہنچ کر حامد علی نے سب سے پہلے جو کام کیا وہ یہ تھا کہ جھونپڑی کے عین وسط میں لکڑی کا جو شہتیر تھا اس میں سوراخ کئے۔ پھر کیل ٹھونک کر اوپر یہ تختی لٹکا دی۔

گاؤں چھوڑ کر جب وہ نوکری کی تلاش میں شہر پہنچا تو تختی بھی ساتھ آئی اور جب بہنوں کی دوڑ دھوپ کے بعد اسے انکم ٹیکس کے محکمے میں ملازمت ملی تو بھی یہ ساتھ تھی اور جب اس نے اپنی جھونپڑی بنائی تو جھونپڑی کے عین وسط میں کھڑے شہتیر پر یہ چسپاں ہو گئی۔

ہر صبح دفتر جاتے سے پہلے چند لمحوں کے لئے وہ اس تختی کے سامنے آ کھڑا ہوتا۔ پھر بلند آواز سے اسے پڑھتا۔

"بیٹا۔ ہمیشہ حلال رزق کھانا"، پھر تختی کے پیچھے سے اس کے باپ کا چہرہ ابھرتا بارعب اور پرشفقت چہرہ۔ وہ مطمئن ہو کر اپنا جستی ٹفن ادوائن کے ٹکڑے سے سائیکل کے کیریئر پر باندھتا اور دفتر کو چل دیتا

وقت کے ساتھ ساتھ اس رزق حلال میں اور افراد بھی شامل ہونے لگے۔ پہلے زینب آئی۔ اس کے آتے ہی جھونپڑی "تاج محل" میں بدل گئی۔ اخراجات میں اضافہ ہوا لیکن حامد علی خوشی خوشی جھیل گئے لیکن جب ایک رات رضا علی چپکے چپکے تشریف لے آیا اور زینب کی حالت بگڑنے لگی تو پہلی بار حامد علی کو اپنا تاج محل لرزتا ہوا محسوس ہوا۔ گاؤں کی پلی زینب

دو چار دن دوا کھانے کے بعد اٹھ بیٹھی۔ لیکن پھر بھی رضا علی کی کمر پر قرض کا پہلا دو ہتڑ پڑ ہی گیا۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ تنگی ترشی کا دور اپنے پنجے تانتے آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ اور حامد علی کو محسوس ہونے لگا کہ حلال کے رزق میں برکت اڑنے لگی ہے۔

ڈیڑھ سال بعد جب ضیا علی آ دھمکا تو حامد علی کو پہلی بار اپنے والد پر غصہ آیا اور بڑبڑایا۔

"اگر نصیحت، کرنی ہی تھی تو زبانی کر لی ہوتی۔ خواہ مخواہ کو یہ تختی میرے گلے میں ڈال دی۔ اور اگر یہ ضروری ہی تھا تو ساتھ میں کوئی جاگیر بھی چھوڑ گئے ہوتے مرتے" اور اس رات پہلی بار بیوی سے بھی تو تو میں میں ہو گئی۔ وہ خواہ مخواہ اس پر برس پڑا تھا۔

اس کے بعد تو جیسے کسی نے گھر میں "تنگلا گاڑ دیا۔ ہر صبح دفتر جانے سے پہلے زینب دو دھاری تلوار کی طرح چلنے لگی اور اس کی زد میں حامد علی کی دسیوں پشتیں آتیں اور دم بھر میں کٹ کر رہ جاتیں اکثر اوقات حامد علی بھی جوتا اتار لیتا۔

"تاج محل" میں دراڑیں پڑ گئی تھیں اور اکھڑا ہوا پلستر بڑے بڑے ڈھیلوں کی صورت میں مکینوں پر برسنے لگا تھا۔

اور ایک دن تو حد ہو گئی۔ بکتے جھکتے زینب کو نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ بھاگ کر کوٹھڑی کی طرف لپکی اور ایک جھٹکے سے تختی اتار لی اور پھر پلک جھپکتے میں باہر بازار میں پھینک دی۔

حامد علی کو محسوس ہوا جیسے وہ بانس کی پھٹے ہوئے سر والی چھڑی سے پھدک کر باہر آ گرا ہے۔ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہوئے اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن اس اثنا میں اس کے باپ کے مضبوط اور تنومند ہاتھ آہستہ آہستہ فضا میں سے اس کی طرف بڑھنے لگے پھر ان ہاتھوں نے اس کی گردن دبوچ لی اور اسے گھسیٹتے ہوئے بازار میں لے آئے اس نے جلدی سے تختی کو اٹھایا اپنی دھوتی کے پلو سے پونچھا اور ایک بار پھر شہتیر پر ٹانگ دیا۔

اسے محسوس ہوا کہ تختی کے پیچھے اس کا باپ جھانک رہا ہے اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ اور وہ اپنی سفید داڑھی کو نوچ رہا ہے۔

حامد علی تیزی سے زینب کی طرف لپکا۔ زینب اس کی آنکھوں میں ابلتا ہوا طوفان دیکھ کر چیخنے لگی۔

اس کی کھال جگہ جگہ سے جلنے لگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی کے پردے پر تارے ناچنے لگے اور پھر وہ وہ دھڑام سے گر پڑی

حامد علی کا ہاتھ رکتا تھا نہ رکا۔ وہ تو اسے جان سے مار ڈالتا لیکن اس دوران چیخ و پکار سن کر سارا محلہ اکٹھا ہو چکا تھا۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے اسے قابو میں کیا۔

زینب ہفتہ بھر بستر سے نہ اٹھ سکی حامد علی شرمندہ سا اس کی تیمار داری کرتا رہا دفتر سے ایک ہفتے کی چھٹی بھی لے لی۔ وہ بچوں کے لئے خود کھانا پکاتا زینب کے منہ میں خود نوالے ڈالتا اور زینب چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی تو اسے زندگی میں پہلی بار رکشا پر بٹھا کر کلفٹن سیر کرانے بھی لے گیا۔

چند دن ماحول اچھا رہا۔ لیکن مہینہ کے اختتام پر جب دکاندار نے ادھار سے ہاتھ کھینچا، زردے چھالیہ اور پان کا قحط پڑنے لگا تو لڑائی جھگڑا پھر پوری شدت سے ابھرے۔ رضا علی اگر پنسل کا تقاضا کرتا تو زینب اس پر چڑھ دوڑتی۔ ضیا علی اگر مٹھائی کے لئے ضد کرتا تو حامد علی برس پڑتا اور اس کے بعد دونوں ایک دوسرے پر الزام دیتے اور ایک دوسرے پر سوار ہو جاتے

لیکن اس کے باوجود جھونپڑی کے وسط میں شہتیر پر لگی تختی وہیں لگی رہی۔ ایک اور دھچکا لگا۔ قیمتیں ایک بار پھر دگنی تگنی ہوئیں اور اس کے ساتھ ہی اب کے عائشہ آئی۔

حامد علی کو جب دائی نے ایک بھول سے بچی ک خوشخبری سنائی تو نجانے کیوں اسے اپنا دل بیٹھتا ہو محسوس ہوا۔ اس نے سوچا لڑکوں کی تو خیر ہوتی ہے ننگے بھی پل جاتے ہیں۔ لیکن لڑکی۔ اس کے ذہن م شہنائیاں بجنے لگیں۔ عائشہ دلہن بنی بیٹھی تھی۔ لیک اس کے تن پر دلہنوں جیسے گوٹے کناری والے لال ج کی بجائے چیتھڑے تھے۔

اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ سخت سرد کے باوجود اس کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔

اس رات وہ ایک لمحہ کے لئے بھی نہ سو سکا کبھی شہنائیوں کی آواز کے ساتھ جگمگاتی ہو روشنیاں ابھرتیں اور اس کے چہرے کے تنے ہو اعصاب ڈھیلے پڑنے لگتے اور کبھی یکایک ان روش کو اندھیرے نگل لیتے اور ان اندھیروں میں سے س چمکتے ہوئے حروف جھانکنے لگتے۔

"بیٹا ہمیشہ حلال رزق کھانا"

صبح منہ اندھیرے اس نے بستر چھوڑ دیا۔ صحن میں چولہا رکھ کر روٹی بنائی اور دونوں بچوں کو کھلائی پھر رضا علی کے ہاتھ زینب کو بھجوا دی۔

تھوڑی دیر بعد تیار ہو کر وہ اپنا حبتی ٹفن سائیکل کے کیریئر پہ باندھنے لگا اتنے میں اندر سے زینب کی کمزور سی آواز آئی۔

"مجھ سے ناراض ہو؟"

حامد علی نے ان سنا کرتے ہوئے سائیکل کو دھکا دے کر اسٹینڈ سے اتارا اور قدم بڑھایا ہی تھا کہ زینب کی آواز پھر آئی۔

"بچی کو بھی نہیں دیکھو گے؟"

"دیکھوں گا" اس نے مختصر سا جواب دیا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔

وہ حسب معمول وقت سے پہلے ہی دفتر پہنچ گیا۔ دفتر میں اکا دکا چپراسی جھاڑ پونچھ میں مصروف تھے وہ تیزی سے چلتا ہوا اپنی سیٹ کی طرف بڑھا تو اس کی نظر سیٹھ نظام پر پڑی جو حامد علی کے ایک ساتھی کی سیٹ پر بیٹھا تھا۔

سیٹھ حامد علی کو دیکھ کر منہ بناتا ہوا باہر کو لپکا لیکن حامد علی کی آواز نے اس کے پاؤں تھام لئے۔

سیٹھ جی کہاں چل دیئے ـــ آیئے بیٹھئے

سیٹھ کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ اس نے حامد علی کے جملے میں طنز تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن حامد علی کے چہرے پر مسکراہٹ پڑھ کر اور بھی پریشان ہو گیا۔

اس نے جلدی سے منہ میں دبا ہوا پان نگل لیا اور کھانستے ہوئے ایک بار پھر حامد علی کی طرف نظریں اٹھائیں

حامد علی بدستور مسکرا رہا تھا۔

سیٹھ جی کبھی ہمارے پاس بھی تو بیٹھا کیجئے" حامد علی نے اپنے ساتھیوں کا سنا سنایا جملہ دوہرا دیا

سیٹھ پریشان سا بتیسی نکالتے ہوئے سامنے کی کرسی پر آ بیٹھا۔

"کیا کام ہے سیٹھ جی؟" حامد علی نے دوسرے رشوت خور کلرکوں کی باتیں یاد کرتے ہوئے پوچھا۔

سیٹھ کاروباری آدمی تھا۔ اس نے بکنے والے ضمیر کو پہچان لیا تھا اب اس کی جھجک دور ہو چکی تھی۔

"ایک فائل گم کرنا ہے۔ پانچ سو" سیٹھ نے منہ حامد علی کے کان کے قریب لا کر سرگوشی کی۔ حامد علی کو محسوس ہوا کہ اس کا باپ مرتے وقت اس سے مخاطب ہے۔ وہ ایک دم اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جھٹکے سے کرسی اوندھی جا گری اسکے منہ سے جھاگ نکلنے لگی۔ اور وہ چیخنے لگا۔

"دفع ہو جاؤ ـ نکل جاؤ ـ کمینے ـ مردود"

سیٹھ ہکا بکا اسے دیکھتا ہوا بھاگ نکلا۔

اور جب وہ واپس کرسی سیدھی کر کے اپنی سیٹ پر بیٹھا تو اسے احساس ہوا کہ وہ رو رہا ہے اس نے جلدی سے ایک دبیز کرم خوردہ رجسٹر اٹھایا اور اپنے آپ کو اس کے پیچھے چھپا لیا۔ لیکن رجسٹر کے پیچھے سے بھی اس کے بلکنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

جھاڑ پونچھ میں مصروف چپراسی نے پہلے تو کوئی توجہ نہ دی لیکن پھر لگاتار ہچکیوں کی آواز سن کر اس سے نہ رہا گیا۔

حامد علی
کو محسوس ہوا
کہ اُس کا تاج محل
لرز رہا ہے

اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا۔

"خان صاحب ـ خیریت ہے؟"

حامد علی نے جیب سے رومال نکال کر آنسو پونچھے اور پھر چپراسی سے صرف اتنا کہا۔

"آج میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ صاحب سے بول دینا" اور باہر نکل گئے۔

نیچے سے انہوں نے اپنی سائیکل لی اور پیدل ہی بڑی سڑک کی طرف چلنے لگا ابھی وہ ریگل کا موڑ مڑا ہی تھا کہ اپنے سامنے انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آیا اس نے جلدی سے سائیکل اٹھا کر فٹ پاتھ پر کر لی۔

جہاں تک نظر جاتی تھی سر ہی سر نظر آ رہے تھے لوگوں کے ہاتھوں میں بڑے بڑے بینر تھے۔ منہ پر عجیب و غریب نعرے تھے پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہجوم نے لب سڑک واقع شراب کی دکان کو آگ لگا دی چند لمحوں بعد ایک نعرہ بلند ہوا "نہیں چلے گی۔ نہیں چلے گی" پورا ہجوم چلا رہا تھا۔

ایک جم غفیر شراب کی دوکان میں گھس گیا۔ شراب کی بوتلیں سڑک پر لوٹنے لگیں۔ کچھ نوجوان رنگ برنگی بوتلیں اٹھائے باہر نکلے۔ کارک کھلے ـ کچھ جلد بازوں نے تو بوتلوں کی گردنیں توڑیں اور غٹا غٹ پینے لگے

آگ بڑھنے لگی۔ شراب کی دوکان کے بعد پان سگریٹ والا کھوکھا جلا۔ اب کے پان سگریٹ لٹے۔ پھر ایک درزی کی دوکان کی باری آئی اور سلے آدھ سلے کپڑے لٹنے لگے ـ اور پھر یہ آگ پھیلتی ہی چلی گئی دیکھتے ہی دیکھتے انقلاب کے نام پر پورا ملک جلنے لگا فضا میں بارود کی بو پھیلنے لگی اس میں انسانی خون کی مہک بھی شامل ہو گئی۔

تقریباً ایک ہفتہ گزر گیا لیکن یہ آگ بجھنے کی بجائے اور بھی بڑھتی گئی۔ ایک سہ پہر کو جب وہ سائیکل لئے دفتر سے نکلا تو اس نے دیکھا کہ بڑی سڑک یوں سنسان ہے جیسے یہاں صدیوں سے کبھی انسان کا گزر ہی نہ ہوا ہو۔ حامد علی کو خوف سا محسوس ہوا اور وہ جلدی جلدی پیڈل چلانے لگا۔

ابھی وہ گھر سے کوئی فرلانگ بھر دور تھا کہ اسے سامنے دھوئیں کے بادل اٹھتے ہوئے نظر آئے؛ فضا میں جلے گوشت کی بو بھی شامل تھی اسے اندازہ ہوا کہ یہ آگ تو اس کے گھر کے آس پاس ہی ہے۔ وہ جنون سا جلدی جلدی سائیکل چلانے لگا۔

اس نے سوچا کہ جھونپڑیاں جلا کر کسی کو کیا ملے گا پھر اس نے اندازہ لگایا کہ آگ کہیں اور لگی ہو گی اور پھیلتی پھیلتی یہاں تک بھی آ پہنچی ہو گی۔ اس کی نظروں کے سامنے اس کی بیوی اور بچے گھومنے لگے۔ اس نے دل ہی دل میں دعا کی کہ خدا کرے وہ سب سلامت ہوں۔

جوں ہی وہ چوراہے سے اپنے گھر کو مڑنے والے بازار میں داخل ہوا تو وہ گرتے گرتے بچا۔

جہاں دور تک پھیلی ہوئی ناہموار جھونپڑیوں کا جنگل سا نظر آیا کرتا تھا ـ وہاں صرف آگ اور

باقی صفحہ ۹۳ پر ملاحظہ فرمائیں



بچوں کا ہاتھ کون روک سکتا ہے!

یہ دِن بھر اپنی توانائی دل کھول کر خرچ کرتے ہیں اور اسی میں اُن کی صحت اور افزائش کا راز ہے۔
اسے غذا اور ٹانک کے ذریعہ بحال کرنا آپ کا کام ہے۔ اپنے بچوں کو بلاناغہ سنکارا دیجئے۔ اس کے استعمال سے صحت کے چشمے پھوٹتے ہیں۔
سنکارا ایک مکمل اور متوازن ٹانک ہے۔ مفید اور مؤثر جڑی بوٹیوں کے نچوڑ کے علاوہ ضروری حیاتین کے اضافے نے اسے
ایک ایسا جامع مرکب بنا دیا ہے جو گھر کے ہر فرد کے لئے ہر موسم میں یکساں مفید ہے۔



سنکارا

حیاتین آمیز صحت بخش ٹانک

ہمدرد لیبوریٹریز (وقف) پاکستان
کراچی۔ لاہور۔ راولپنڈی۔ ڈھاکہ۔ چٹاگانگ

ہمدرد

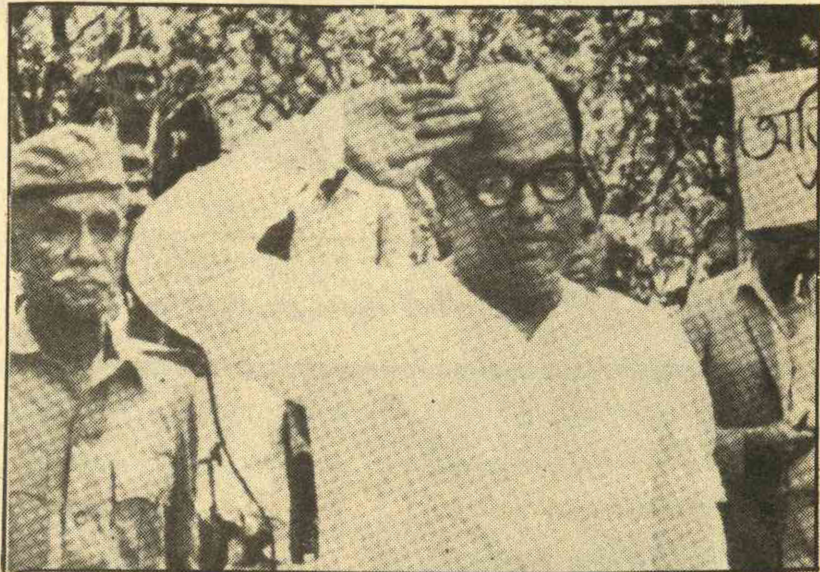
Adarts HC12171

ایڈیل لائف انشورنس کمپنی نے "بنگلہ دیش" کو تسلیم کرلیا

محمود شام کے قلم سے

بات آخری دن تک آپہنچی ہے -

۲۵ مارچ - مجیب راج کا آخری دن - اس روز "پیپل" کی سرخیاں کچھ گھبرائی گھبراتی دکھائی دیتی ہیں - آج کی شہ سرخی یہ ہے - سید پور میں ۱۵ ہلاک -



نام نہاد بنگلہ دیش کے قائم مقام صدر نذر الاسلام - سلامی لے رہے ہیں - ان کے پیچھے کرنل عثمانی کھڑے ہیں - جو بھارت میں "مکتی فوج" کو تربیت دے رہے ہیں - انہوں نے بنگلہ دیش کے کمانڈر انچیف بننے کا خواب دیکھا تھا - اس نام نہاد تقریب کی یہ تصویر برطانوی اخبارات نے اپنی پاکستان دشمنی کی تسکین کے لئے شائع کی -

"چھوٹے فوجی افسر مذاکرات کو ناکام بنانے پر تلے ہوئے ہیں - مختلف علاقوں میں اشتعال کی کوششیں جاری ہیں۔"

دوسری خبر یہ ہے :- بنگالی فوجی افسروں کو اہم حیثیتوں سے ہٹایا جا رہا ہے -

مجیب صاحب فرما رہے ہیں "ہم بنگلہ دیش کے عوام کو آزاد کروا کے رہیں گے"

طالب علم ایکشن کمیٹی کی طرف سے میرپور کے غیر مقامی باشندوں کو اشتعال انگیزی کی کوشش کرنے پر انتباہ ایک جگہ ان "مجرموں" کے نام دیئے گئے ہیں - جو ڈھاکہ چھاؤنی میں کھانا لے کر جاتے ہیں -

(۱) چاند میاں

(۲) عطاء الحق (صدر گھاٹ)

(۳) عبدالسلام

(۴) کریم الدین

بھٹو یحییٰ ملاقات

پھر یہ خبر دی گئی ہے کہ "بھٹو نے رات گئے ۳۰-۱۱ بجے سے ۴۵-۱۲ کے درمیان صدر یحییٰ سے

ملاقات کی۔"

ہلاک شدگان کا مدفن

پھر ایک نقشہ کے ذریعے بتایا گیا ہے کہ چھاؤنی کے پیچھے ایک بہت بڑا گڑھا کھودا گیا ہے۔ جس میں بہت سی لاشیں دفنا دی گئی ہیں۔

نیشنل بنک آف پاکستان کا اشتہار

حیرت انگیز امر یہ ہے کہ نیم سرکاری بنک "نیشنل بنک آف پاکستان" نے بھی اس ہجوم عاشقاں میں شامل ہو کر ایک اشتہار دیا۔ جس کا متن یہ تھا "قومی زندگی کے اس تاریخی موڑ پر بنگلہ دیش کی معیشت کو ہر قسم کے خطرے سے آزاد کرنے کے لئے نیشنل بنک تیار ہے"

یہاں یہ خاص طور پر نوٹ کیجئے کہ نیشنل بنک کے ساتھ "آف پاکستان" کا لفظ نہیں ہے۔

اشتہار کے اوپر جلی حروف میں یہ لکھا ہوا ہے۔

"بنگلہ دیش کی خدمت کے لئے بنگلہ دیش کا سب سے بڑا بنک نیشنل بنک" معلوم ہوتا ہے کہ سب بینکوں کی دوڑ لگی ہوتی تھی کہ کون بنگلہ دیش کی زیادہ خدمت کا اعلان کر کے سرخروئی حاصل کرتا ہے۔

آئیڈیل لائف انشورنس کمپنی کا بیان

"الاکو" کی طرف سے دیئے گئے اشتہار میں تو حد کر دی گئی۔ انہوں نے پورے صفحہ کا اشتہار بنگلہ دیش کو باقاعدہ تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے۔ یہ بیان تو بہت طویل ہے۔ مگر میں نے اس میں سے مختصر سا حصہ لیا ہے۔

"میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ میرا فرض ہے کہ میں اپنے تمام بیمہ داروں، خیرخواہوں کو مطلع کروں کہ اب بنگلہ دیش کے ساڑھے سات کروڑ عوام ایک چٹان کی طرح متحد ہو چکے ہیں اور شیخ مجیب الرحمان کی قیادت میں استحصال کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں۔ تاکہ ایک آزاد ملک کے آزاد شہری کی طرح زندگی بسر کر سکیں۔ خدا نے چاہا تو ہم اپنا مقصد ضرور حاصل کر لیں گے۔"

{ایس یو احمد ڈپٹی جنرل منیجر
برائے بنگلہ دیش}
آئیڈیل لائف انشورنس کمپنی۔ مغربی پاکستان

یونائیٹڈ بنک نے "جے بنگلہ" کا نعرہ بلند کیا

ہیں بھی کاروبار کرتی ہے۔ ایک پاکستان میں رہتے ہوئے کسی یک طرفہ اعلان آزادی کے بغیر ہی اس کاروباری کمپنی نے "بنگلہ دیش" کو خود مختار اور آزاد کروا دیا۔ کیا آئیڈیل ہے۔

یہ ۲۵ رمارچ کی صبح تھی۔ اخبار شائع ہو چکا مگر ڈھاکے پر خاموشی طاری ہے۔ دھان منڈی میں خاموشی ہے۔ کل جہاں کاروں کی قطار ہوتی تھی، آج وہاں بالکل ویرانی ہے۔ شیخ مجیب الرحمان بھی گھر میں اکیلے ہیں۔ آج ایسا لگ رہا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔ مذاکرات کی خبر اچھی نہیں ہے۔ تاج الدین اینڈ کو ۲۴ رمارچ کو ہی کہہ چکے ہیں کہ اب مزید مذاکرات کی ضرورت نہیں ہم نے جو مطالبے کئے ہیں مان لئے جائیں تو ٹھیک ہے ورنہ اس کے علاوہ کسی مسئلے پر مصالحت نہ ہوگی۔ آج تیاریاں ہیں۔ چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ مذاکرات ناکام ہو چکے ہیں۔ ۲۴ رکو دولتانہ، قیوم خاں، مولانا مفتی محمود، مولانا غلام غوث ہزاروی، مولانا شاہ احمد نورانی واپس چلے گئے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصالحت کا وقت گزر چکا ہے۔ بھٹو کے کچھ ساتھی چلے گئے ہیں۔ کچھ باقی ہیں۔ شہر خاموش ہے۔ ۱۱ بجے دھماکوں، فائروں

এবারের সংগ্রাম মুক্তির সংগ্রাম

— বঙ্গবন্ধু

বাংলা দেশের মানুষ আজ নতুন ক'রে আবিষ্কার ক'রেছে নিজের সোনার দেশকে। আবিষ্কার করেছে নিজেকে। পরিচয়ের প্রথম প্রহরেই তাই বাংলার মানুষের কণ্ঠে বজ্র নিনাদ ঘোষণা—"স্বাধিকার।"
সাথে সাথে দৃঢ় প্রত্যয়। নিজের পায়ে নিজেকে দাঁড়াতে হবে। এ প্রত্যয় নিয়েই আমাদের যাত্রা শুরু হয়েছিল। আজ সে প্রত্যয় দৃঢ় থেকে দৃঢ়তর হ'চ্ছে।

ইষ্টার্ণ ব্যাংকিং করপোরেশন
আপনার ব্যাংক : বাংলাদেশের ব্যাংক

اسلام پسندوں کے ممدوح "نورالامین کی ایسٹرن بنکنگ کارپوریشن کا اشتہار، ہتھکڑیاں ٹوٹ رہی ہیں - ایسٹرن بینکنگ کارپوریشن مارچ کے ۲۵ دنوں میں بنگلہ دیش کا سٹیٹ بنک بنی رہی - اب اسلام پسند نورالامین صاحب کو ملک کا آئندہ وزیر اعظم بنانے کی فکر میں ہیں

বাঙলার ধন বাঙলায়...

'মুসলিম' বাঙলাদেশের আদি বীমাপ্রতিষ্ঠান
বাঙলার সেবাই মুসলিমের মূললক্ষ্য।
বাঙলার মূলধন ও লভ্যাংশই
মুসলিমের পবিত্র পুঁজি।
বাঙলার ধন বাঙলায়ঃ
এই মুসলিমের মূল বক্তব্য।



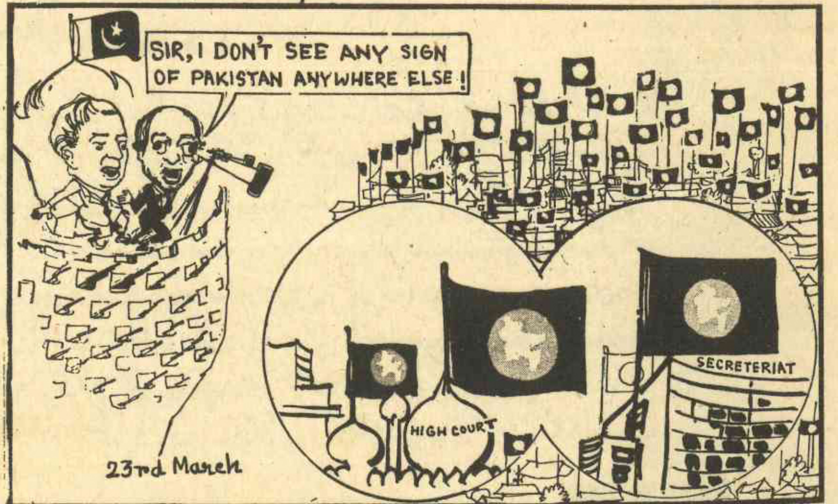
মুসলিম ইনসিওরেন্স কোং লিঃ
মুসলিম ইনসিওরেন্স বিল্ডিং, ঢাকা-২

مسلم انشورنس کمپنی نے اشتہارات دے کر عوامی لیگ کی سرپرستی کی

مشرقی پاکستان میں کیا ہوگا؟

ماضی مستقبل کا آئینہ ہے

کی آوازیں شروع ہو جاتی ہیں - اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اخبارات میں آچکا ہے - اب کیا ہو رہا ہے، وہ بھی اخبارات میں آتا رہتا ہے - ہم نے اس سلسلے میں پس منظر کا جائزہ لیا ہے اگرچہ ہم نے یکم مارچ سے ۲۵ مارچ تک کے واقعات کا "پیپل" کے ذریعے خاص طور پر سامنے رکھے ہیں. لیکن اس کے ساتھ ساتھ گزشتہ واقعات، خاص طور پر گذشتہ دو برس کے عوامل کا بھی ذکر کیا ہے. مشرقی پاکستان کے عوام کو اب جن المناک واقعات سے دوچار ہونا پڑا وہ دو چار مہینے کا نہیں گذشتہ دو برس کی ڈھیل کا نتیجہ ہے. "مشرقی پاکستان میں کیا ہوا" کا سلسلہ ختم ہو گیا - ہم نے جو کچھ خلوص دل سے محسوس کیا، لکھ دیا اب محب وطن افراد کا فرض ہے کہ وہ ان واقعات کا اعادہ نہ ہونے دیں جو جو عوامی تحریک کو عوامی سازش میں بدل دیتے ہیں۔ "مشرقی پاکستان میں کیا ہوگا" یہ سوال آج ہر مغربی پاکستانی کے لبوں پر ہے اس پر کچھ کہنا کئی مصلحتوں کے تحت مناسب نہیں ہے، لیکن واقعات کی ترتیب تو ایک سی ہوتی ہے. مستقبل کو ماضی کے آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے - جو غلطیاں پہلے ہوئیں اگر وہی دہرائی گئیں تو وہی ہو گا جو ہو چکا اور اگر ان غلطیوں سے احتراز کیا گیا تو وہ نہیں ہو گا - جو ہو چکا۔



۲۴ مارچ کے "پیپلز" میں چھپنے والا کارٹون جس میں "پاکستان" کا نشان نظر نہ آنے پر خوشی کا اظہار کیا گیا -

راجشاہی سلک...

...کس قدر ملائم اور دلکش ہے یہ ریشم۔ بس طبیعت چاہتی ہے اسے دیکھتے ہی رہیئے۔ مشرقی پاکستان کا شہر راجشاہی جو اپنے ریشم کیلئے خاصا مشہور ہے آپکے لئے دلکش اور نفیس ساڑیاں تیار کرتا ہے لیکن آپ صرف ان ساڑیوں کیلئے مشرقی پاکستان کیوں جائیں جب وہ ساڑیاں آپکے شہر میں بھی مل سکتی ہیں۔ مل سے لیکر دور دراز شہروں اور دوکانوں تک ان ساڑیوں کو اس قدر حفاظت سے پہنچانا یقیناً کسی تجربہ کار اور باکمال فضائی سروس کی کارگزاری ہے کیونکہ نہ تو اس میں شکن پڑتی ہے اور نہ کسی قسم کا داغ دھبا لگنے پاتا ہے اور اسکی دلکشی اور نفاست اسی طرح برقرار رہتی ہے۔ کپڑا بننے والوں اور پہننے والوں کے درمیان واحد کڑی پی آئی اے کارگو سروس ہی ہو سکتی ہے۔ آپ ایسی کسی خدمت کیلئے جب کبھی پی آئی اے کارگو سے رابطہ قائم کریں گے انہیں ہمیشہ مستعد پائینگے۔ پی آئی اے کی کارکردگی کو صرف ایک بار آزمانے کے بعد آپ بھی کہیں گے...

PIA شکریہ

IAL-IPP-4/71





سنو! آواز آ رہی ہے

محمد اقبال میر

سنو آواز آ رہی ہے۔

یہ آواز ابتدائے آفرینش سے آ رہی ہے۔۔ اللہ بہت بڑا ہے۔ اللہ بہت بڑا ہے۔ یہ آواز آدم نے بھی سنی۔ آدم نے سنائی بھی۔ یہ آواز گونج بنتی چلی گئی۔ بازگشت بھی بنتی رہی۔

سامع مجسمۂ اقرار بھی بنا اور مجسمۂ انکار بھی

سامع پھر سامع تھا، سامع پھر سامع ہے

سنو! یہ آواز، یہ گونج، یہ بازگشت صدیوں سے منزلیں طے کر رہی ہے۔ مختلف دور، مختلف انسان جن میں انبیا بھی تھے، معلمین بھی اور مفکر بھی۔ سامع کو یہ آواز دیتے رہے، سامع لبیک کہتا رہا۔ صاد کرتا رہا۔ واقعی اللہ بہت بڑا ہے۔ اللہ بہت بڑا ہے۔

اس آواز، اس صدا نے مختلف ادوار میں عظیم معاشروں، عظیم تہذیبوں اور ہمہ گیر مذاہب کا روپ دھارا، لیکن بہروپ ہمیشہ آڑے آیا۔

سامع نے یہ آواز دینے والے کو آتشِ نمرود میں بے خطر کودتے دیکھا۔

پھر اس نے وادیٔ سینا میں بھی صدا بلند کرنے والے کو اس وادی سے بے سروسامان نکلتے دیکھا۔

اور جب پھر یہ آواز بلند ہوئی تو آواز دینے والے کو سولی پر چڑھتے بھی دیکھا گیا۔

سامع مبہوت تھا۔

سامع گنگ تھا۔

سامع نے ہمیشہ جب یہ صدا سنی تو اپنے آپ کو اس صدا کے سپرد کر دیا۔

یہ صدا ارض و سما کے سینے میں پکار بن کر پھیل گئی۔

پھر وقت بیتنے کے ساتھ ساتھ سامع مجموعۂ تضاد اور مجمعِ انکار بھی بننے لگا۔

سنو! یہ صدا ہولے ہولے آخری بار اونچی ہو رہی ہے —— اور اونچی —— اور اونچی ہوتی چلی جا رہی ہے۔

اسی کے سامع تک یہ آواز تلاش، جستجو، تڑپ اور اضطراب کے کڑے چالیس برس طے کر کے پہنچی۔ چالیس برس تک یہ صدا غاروں، صحراؤں اور راستوں پہ اظہار کے مراحل طے کرتی رہی۔ پھر ایک روز کوہِ صفا سے ندا آئی۔

"تم مجھے بتاؤ کہ تم مجھے سچا سمجھتے ہو یا جھوٹا جانتے ہو۔"

سامع کا جواب تھا: "ہم نے کوئی بات غلط یا بیہودہ تیرے منہ سے نہیں سنی۔ ہم یقین کرتے ہیں کہ تو صادق اور امین ہے۔"

پھر اس آواز نے کہا: "دیکھو! میں پہاڑی کی چوٹی پہ کھڑا ہوں اور تم اس کے نیچے ہو، میں پہاڑ کے اِدھر بھی دیکھ رہا ہوں اور اُدھر بھی نظر کر رہا ہوں۔ اچھا اگر میں یہ کہوں کہ رہزنوں کا ایک مسلح گروہ دور سے نظر آ رہا ہے جو مکہ پر حملہ آور ہوگا، کیا تم اس کا یقین کر لو گے۔"

سامع نے کہا: "بے شک! کیونکہ ہمارے پاس تجھ جیسے راست باز آدمی کے جھٹلانے کی کوئی وجہ نہیں خصوصاً جب کہ وہ ایسے بلند مقام پہ کھڑا ہے کہ دونوں طرف دیکھ رہا ہے۔"

آواز نے کہا: "یہ سب کچھ سمجھانے کے لئے ایک مثال تھی۔ اب یہ یقین کر لو کہ موت تمہارے سر پہ آ رہی ہے اور تمہیں خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور میں عالمِ آخرت کو بھی ایسا ہی دیکھ رہا ہوں جیسا کہ دنیا پہ تمہاری نظر ہے۔"

سامع مجمعِ اقرار بنتا چلا گیا۔ آواز پہ دور دور سے لوگ کھنچتے آتے رہے۔ غریب بھی، امیر بھی۔ غلام بھی آقا بھی۔ سامع نے ایک عظیم معاشرے کو جنم لیتے دیکھا جس میں آقا کو غلام پر ترجیح حاصل تھی نہ غلام کو آقا پر۔ ایسا معاشرہ۔ جس میں ایک حبشی غلام کی صدا پر بڑے بڑے لوگ مسجد میں سر جھکانے چلے آتے تھے۔ پھر سامع نے دیکھا کہ دشمن سے ایک جنگ کے دوران آواز دینے والے نے بھی پیٹ پہ پتھر باندھ کر بھوک کو دبایا ہوا ہے۔ سامع نے سنا کہ "عائشہ! یہ گوشت کا ٹکڑا پتھر اس لئے بن گیا کہ تم نے کسی ضرورت مند کو خالی ہاتھ لوٹا دیا ہے۔" سامع مجسم اقرار اور مجسم تعمیل بن گیا۔

مخالفتیں محبتوں میں ڈھل گئیں، پستیاں بلندیوں میں ابھر آئیں، آقا اور غلام کا امتیاز ختم ہوتا چلا گیا۔ غلامی کی زنجیریں تیزی سے ٹوٹنے لگیں، سامع نے عزتِ نفس کو پہچانا۔ اس

کی معراج کا آغاز ہوا۔ وہ بلندی کی طرف گامزن ہوتا چلا گیا۔ عبد اور معبود کے درمیان ایک براہ راست تعلق قائم ہوتا چلا گیا۔ سامع نے اس حقیقت کو پایا کہ ——

"مَن عرفَ نفسہ، فقد عرفَ ربہ"

اب اس رشتے میں اسے کسی واسطے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔

اس تقدس کی فضا میں آخری بار یہ آواز بلند ہوئی:۔

"لوگو! میں خیال کرتا ہوں کہ میں اور تم پھر کبھی اس مجلس میں اکٹھے نہیں ہوں گے۔ لوگو! تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزتیں ایک دوسرے پر ایسی ہی حرام ہیں جیسا کہ تم آج کے دن کی، اس شہر کی، اس مہینے کی حرمت کرتے ہو۔ لوگو! تمہیں عنقریب خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی بابت سوال فرمائے گا۔ خبردار! میرے بعد گمراہ نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو...... لوگو! نہ تو میرے بعد کوئی پیغمبر ہے اور نہ کوئی جدید امت پیدا ہونے والی ہے۔ خوب سن لو کہ اپنے پروردگار کی عبادت کرو اور پنجگانہ نماز ادا کرو۔ سال بھر میں ایک مہینہ رمضان کے روزے رکھو۔ مالوں کی زکوٰۃ نہایت دلی خوشی کے ساتھ دیا کرو۔ خانہ خدا کا حج بجا لاؤ......"

پھر اس آواز نے کہا:

"تم لوگوں میں نہ تو کوئی عربی کسی عجمی سے بلند ہے اور نہ ہی کوئی عجمی کسی عربی سے محترم ہے۔ تم میں کوئی کالا کسی گورے سے افضل نہیں اور نہ ہی کسی گورے کو کسی کالے پر فضیلت ہے........

تم میں سے ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔

تم اپنے غلاموں کا خیال رکھنا...... ہاں ضرور اپنے غلاموں کا خیال رکھنا۔ ان کو وہی چیز کھلانا جو تم کو پسند ہو۔ ان کو وہی پہنانا جو تم خود پہنو........ دیکھو! جو لوگ موجود ہیں، وہ ان لوگوں کو جو موجود نہیں ہیں ان کی تبلیغ کرتے رہیں، ممکن ہے بعض سامعین سے وہ لوگ زیادہ تر اس کلام کو یاد رکھنے اور حفاظت کرنے والے ہوں، جن پر تبلیغ کی جائے...."

سامع نے ایک ایک لفظ کو دل پر نقش کر لیا۔ پھر سامع نے اس آواز کے پیغام کی خوشبو پھیلتی دیکھی۔

خوشبو پھیلتی رہی۔

پھر سامع نے دیکھا کہ اس آواز کو لے کر چلنے والے نے اپنے ساتھیوں کی ضد کے باوجود اس لشکر کو دوبارہ اس مہم پر بھیجا۔ جس پر آخری آواز دینے والے نے بھیجا تھا۔ ایک قبیلے نے مال پر زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لشکر کی سربراہی ایک غلام کر رہا تھا۔ سامع نے سنا کہ اس آواز کا پیغام اس سرکش قبیلے تک دوبارہ پہنچا دیا گیا، کہ "مالوں کی زکوٰۃ نہایت دلی خوشی کے ساتھ دیا کرو۔"

پھر سامع نے یہ الفاظ بھی سنے۔ "بی بی! جتنا میٹھا تم نے ہر روز بچایا ہے، یہ ہماری ضرورت سے زاید ہے آئندہ تمہیں اتنا میٹھا بھی کم ملا کرے گا۔"

سامع اس آواز کو آگے لے کر چلنے والے کے ساتھ دل و جان سے ہو گیا۔ پھر سامع نے ایک مجمع میں معاشرے کی سب سے بڑی شخصیت سے یہ سوال ہوتے بھی سنا:

"تمہارا قد بڑا ہے۔ مالِ غنیمت میں جو کپڑا ملا تھا وہ تمہارے جبّے کے لئے ناکافی تھا۔ جواب دیجئے کہ باقی کپڑا کہاں سے ملا —؟"

عمر نے جواب دیا "میں نے اپنے بیٹے عبداللہ کے حصے کا کپڑا شامل کر کے اپنا جبّہ سلوایا ہے۔"

سامع نے بھائیوں کو بھائیوں کے خون کا پیاسا بھی دیکھا

سامع نے اس پیغام سنانے والے کو بھی لبیک کہا۔ پھر سامع نے سنا کہ آواز کو آگے پہنچانے کا منصب ایک غنی کے سپرد ہوا ہے۔ اس نے سنا کہ ایک محلے کے لوگوں کو پانی میں دقت ہوتی ہے۔ کنواں، جہاں سے پانی ملتا ہے، وہ کسی مالدار یہودی کے پاس ہے۔ اس نے مالدار یہودی کے منہ مانگے دام دے کر وہ کنواں اس علاقے کے لوگوں کی ملکیت بنا دیا۔

سامع نے زمانے کی دھڑکنیں سنیں۔ ایک سربراہ مملکت اپنی بیوی سے کہہ رہا ہے کہ ہم خادم رکھنے کی حیثیت میں نہیں ہیں۔ بیوی کے ہاتھوں پر آٹا پیسنے سے چھالے پڑ گئے ہیں۔

سامع مجسمہ اقرار بنا رہا، سامع سنتا رہا۔ لمحے سالوں میں تبدیل ہو گئے، پیغام کی خوشبو پھیلتی رہی۔ اس خوشبو میں خون کی خوشبو بھی شامل ہو گئی۔ جب مصلحتیں عقیدتوں پر رنگ جمانے لگیں، دریائے فرات کے کنارے اس آواز کے پیغام کو ابدیت بخشنے کے لئے آواز کو آگے پہنچانے والے خون کے دریاؤں کو عبور کرنے لگے، فرات رنگین ہو گیا۔ سامع نے خون کی خوشبو پھیلتی دیکھی سامع مجسم قربانی بن گیا۔ اس نے آمریت کے خلاف مزاحمت کی ٹھانی۔ اپنے خون کی خوشبو کو پیغام کی خوشبو کی نذر کر دیا۔ مگر پیغام کی خوشبو لے کر قریہ قریہ جانے والے خاندانوں میں بٹ گئے۔ عربی کو عجمی پر فوقیت حاصل ہونے لگی۔ گورا کالے سے افضل ہونے لگا۔ سامع نے تاریخ کے ورق الٹتے دیکھے، زمانوں کی چاپ سنی، سامع سامع تھا، سامع رہا۔ رنگ بدلتے دیکھتا رہا۔ ہنگامے سنتا رہا۔ سلطنتیں تہ و بالا ہو گئیں۔ مالوں کی زکوٰۃ خوشی سے نہ دی گئی۔ لوگوں نے اپنی ڈیوڑھیوں پر دربان بٹھا لئے۔ عبد اور معبود کے درمیان وسیلے ختم کرنے کا عہد کرنے والوں نے اپنے اور لوگوں کے درمیان وسیلے کھڑے کر دیئے۔ رعایا جھونپڑیوں میں رہتی رہی۔ راعی محلات میں دربانوں، حرم سراؤں اور غلاموں کی دیواروں کے درمیان رہنے لگے۔ رشتے جو پختہ ہو رہے تھے ٹوٹ گئے۔

پیغام سننے والے ہمہ تن گوش رہے۔ پیغام سنانے والے دوسروں کے حقوق غصب کرنے میں محو ہو گئے۔ پھر لوگ ریشمی کپڑے پہنتے رہے۔ کسی عمر نے وضاحت نہ کی کہ اس کے پاس اس قدر وافر کپڑا کہاں سے آیا۔ اولی الامر اور لوگوں کے درمیان سینکڑوں دیواریں کھڑی ہو گئیں۔ سامع مجسم حیرت بن گیا۔

سامع بٹ گئے۔ خاندانوں میں، خلافتوں میں،

میں تمہیں سرزمینِ مصر سے گھسیٹتا ہُوا مدینے کی گلیوں میں لاؤں گا

بادشاہتوں میں، سلطنتوں میں۔ سامع ایک دوسرے کی جان کے درپے ہو گئے۔ کہیں کہیں کوئی زبان اس آواز کے پیغام کو بلند کرتی تھی۔ مگر وہ صدا بصحرا ثابت ہوتی تھی۔ سامع پریشان تھا، اداس تھا، مایوس تھا۔

سامع نے سنا کہ ایک سترہ سالہ نوجوان اس آواز کو لے کر دُور دراز کے ایک ملک میں آیا۔ اس نے پیغام پہنچایا۔ یہاں بھی سامع نے لبیک کہا۔ اس پیغام کی خوشبو اس علاقے میں بھی پھیلنے لگی۔ خوشبو پھیل رہی تھی۔ اس آواز کے وارث۔ اس بہت بڑی اقلیم کے وارث بھی بن گئے۔

سامع مجسم اقرار تھا۔ سامع نے اس صدا پر بھی لبیک کہا جس کی گردن جہانگیر کے آگے نہ جھکی۔ جس نے کہا کسی بندے کو دوسرے بندے پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔ سامع نے لبیک کہا۔ سامع نے بھائیوں کو بھائیوں کے خون کا پیاسا بھی دیکھا۔ سامع کو یاد آیا "تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزتیں ایک دوسرے پر ایسی ہی حرام ہیں جیسا کہ تم آج کے دن کی، اس شہر کی، اس مہینے کی حرمت کرتے ہو......"

سامع سامع تھا۔ وہ ماضی میں بھی سنتا رہا تھا۔ اب بھی سن رہا تھا۔ پھر اس نے سنا گورے کالوں پر فوقیت پا گئے۔ جب کسی نے پیغام سنایا کہ "میرے بعد نہ کوئی پیغمبر ہے اور نہ کوئی جدید اُمت پیدا ہونے والی ہے" اور کسی گورے کو کالے پر فوقیت نہیں ہے تو سامع نے لوگوں کو اس پر لبیک کہتے ہوئے غلامی کی زنجیریں توڑنے کے لئے کھڑے ہوتے دیکھا۔ لیکن گورے کالوں پر فضل رہے۔ خون کے دریا بہنے لگے۔ سامع سنتا رہا۔ سامع کو سنائی دیا: "یہ زمین رہنے کے قابل نہیں ہے یہاں سے کوچ کر چلو" سامع نے ہزاروں قوموں کی جاتے وقت چاپ سنی۔ پھر سامع نے ان ہی قدموں کی آتے وقت آہٹیں سنیں۔ سامع سامع تھا، سنتا رہا۔ خون کا دریا بہتا رہا۔ زنجیروں کی کھنک سنائی دیتی رہی۔ پھر سامع نے غلامی کے خاتمے اور آزادی کے نعرے بھی سنے۔ خون کا دریا بہتا رہا۔ پھر سامع نے ایک درد میں ڈوبی ہوئی آواز سنی!

کبھی اے نوجوان مسلم تدبّر بھی کیا تو نے
کہ کس گردوں کا ہے ٹوٹا ہوا تارہ

اڑالی قمریوں نے، طوطیوں نے عندلیبوں نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

سامع کو یاد آیا کسی گورے کو کالے پر فضیلت نہیں ہے۔ ہر شخص اپنے اعمال کا جواب دہ ہے۔ ہم سب کو ایک روز خدا کے سامنے جوابدہ ہونا ہے۔ سامع نے سنا۔ سامع کو یاد آیا کہ عبد اور معبود کے درمیان کوئی وسیلہ نہیں۔

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا، کلیسا سے اُٹھا دو

اللہ بہت بڑا ہے۔ اللہ بہت بڑا ہے۔ سامع نے بارِ امانت اٹھانے کا پھر عہد کیا کہ کوئی گورا کسی کالے پر افضل نہیں ہے۔ اور بدیسی سامراج کو للکارا اور اس رزق کو خیرباد کہہ دیا جس سے پرواز میں کوتاہی آتی تھی۔ اس نے محسوس کیا۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

ذوقِ یقیں پھر ایسا پیدا ہوا کہ زنجیریں کٹ گئیں۔ سامع نے زنجیریں ٹوٹنے کی جھنکار سنی اور ستائیسویں شب رمضان نے گواہی دی کہ سامع آزاد ہے! اس نے لیلۃ القدر پالی۔ لیلۃ القدر کی برکتیں اب اس کا مقدر بنیں گی۔

سامع کو پیغام ملا: "پاکستان میں رہنے والے سب ایک ہیں۔ جس روز ہم پنجابی، بنگالی، بلوچی، پٹھان یا سندھی بن گئے۔ اس روز پاکستان ختم ہو جائے گا۔"

آقا اور غلام کا امتیاز
ختم ——— غلامی کی
زنجیریں ٹوٹ گئیں

سامع نے سنا: "پاکستان کے رہنے والے اپنے حاکم خود چنیں گے۔ سرکاری افسر اپنے آپ کو لوگوں کے خادم سمجھیں آقا نہ سمجھیں، سرکاری افسروں کو کسی سیاسی پارٹی یا سیاسی جماعت سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیئے۔ حکومت سیاست دانوں کا کام ہے خدمت سرکاری افسروں کا۔"

سامع نے سنا: "اب یہاں کوئی غریب اور کوئی امیر نہ رہے گا۔ اب نہ کوئی ایاز ہے اور نہ محمود۔"

سامع سامع تھا، سامع سامع ہے۔ سامع سنتا رہا، سامع سنتا رہے گا۔ پاکستان اسلام کی بنیاد پر بنا ہے۔ اسلامی معاشرہ قائم ہو گا۔ سامع نے لبیک کہا، سامع کو یاد آیا۔ مالوں کی زکوٰۃ دلی خوشی کے ساتھ دو۔ اپنے غلاموں کو وہی پہنانا جو خود پہنو۔ سامع نے سنا۔ امیر، امیر تر ہوتے جا رہے ہیں، غریب غریب تر۔

سنو! آواز آرہی ہے۔ "مال جمع کرنے والوں پر اللہ کا عذاب ہے۔ میں تمہارے سپرد امانت کر کے جا رہا ہوں۔ اب تم اس ذمہ داری کو نبھانا۔"

سنو! اب صدا لگانے والوں نے کہا! ہم غریبوں کو اس ملک کا مالک بنائیں گے۔ ہم غریبوں کی قربانیاں رائیگاں نہیں جانے دیں گے۔"

سامع دیکھ رہا تھا: دولت چند خاندانوں میں سمٹتی جا رہی ہے۔ سیاست چند گھرانوں کی باندی بن کر رہ گئی ہے۔ سامع پھر بھی مجسمہ اقرار بنا رہا۔

سامع نے دھماکے سنے اور اس کے ساتھ یہ الفاظ بھی:

"دشمن نہیں جانتا کہ اسے کس قوم نے للکارا ہے۔ جس کے دل میں لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کے الفاظ دھڑکتے ہیں۔"

سامع پھر مجسمۂ اقرار بن گیا۔

سامع نے سرحدوں پر آگ اور خون کے دریا اُبھرتے دیکھے۔ وطن کے بیٹے، جیالے غازی سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئے۔

سامع نے وطن کے بیٹوں کو اس آگ میں بے خطر کودتے دیکھا۔ سرحدیں خون سے لالہ زار ہو گئیں۔ پھر سامع نے سنا شہیدوں کا لہو بیچ دیا گیا۔ ایک آمر نے اپنی آمریت کو بچانے کے لئے قوم کی عزت کا

سامع اپنا حق مانگ رہا ہے، احتساب چاہتا ہے

سودا کر لیا۔"

سامع نے لبیک کہا۔ اور ان ہزاروں لاکھوں میں شامل ہوگیا جو مجسم احتجاج بنے ہوئے تھے۔ سامع نے گولیوں، لاٹھیوں، دھماکوں میں سے یہ جملے بھی سنے!

"میں ملک کی تباہی پر صدارت نہیں کر سکتا۔ میں ملک کا نظم ونسق فوج کے سپرد کر رہا ہوں۔"

اور بار امانت جیالے اور بے لوث غازیوں نے اُٹھا لیا۔ "افہام وتفہیم کی راہیں کھلیں" پھر سامع نے سنا:

"ہم ظالموں کا خون چوس کر رہیں گے سرمایہ داروں سے دولت، جاگیرداروں سے زمینیں چھینی جائیں گی۔"

سامع نے سنا: "کیا اس ملک کے غریبوں کی قسمت یہی ہے کہ وہ ہمیشہ غریب رہیں۔ ان کے گھروں میں چراغ روشن نہ ہوں۔ ان کے بچے تعلیم سے محروم رہیں۔ کیا یہ قدرت کا اصول ہے۔"

سامع نے لبیک کہا۔ سامع کے کانوں میں اب اس آواز کی بازگشت موجزن تھی:

"اے عمرو بن العاص! میں نے سنا ہے کہ تم نے مال وزر اکٹھا کر لیا ہے۔ عالی شان محلات تعمیر کر لئے ہیں اور ریشم کا پہناوا بنا لیا ہے۔ میں تم سے مال ومنال کا حساب پوچھتا ہوں۔ اگر تم اس کا حساب نہ دے سکے تو مجھے قسم ہے اس خدا کی جو بہت بڑا ہے۔ واقعی بہت بڑا ہے۔ میں تمہیں بالوں سے پکڑ کر سرزمین مصر سے گھسیٹتا ہوا مدینے کی گلیوں میں لاؤں گا۔ تم سے تمہارے بارِ امانت کا حساب چکاؤں گا۔" سامع ایک سوالیہ نشان بن گیا

سنو! یہ پیغام "مالداروں سے اپنے مال کا حساب لیا جائے گا۔ لوٹ کھسوٹ ہی سے ان کے مظالم کا احتساب کیا جائے گا۔ ہم کسی کو معاف نہیں کریں گے۔ عوام کے خون پسینے کی کمائی سے تنخواہیں پانے والے افسران آقا بن بیٹھے ہیں۔"

سامع کو یاد آیا۔ "اے معاویہ! میں نے سنا ہے کہ تم نے اپنی ڈیوڑھی پر دربان بٹھا دیا ہے۔ تم دربار بھی لگاتے ہو۔ تم راعی اور رعیت کے درمیان دیواریں اونچی کرتے جا رہے ہو۔ مجھے خدا کے سامنے جواب دینا ہے۔ ڈر ہے کہ تم کہیں گمراہ نہ ہو جاؤ۔"

سامع جس کے بچے بھوک سے بلک رہے ہیں۔ افلاس سے تڑپ رہے ہیں۔ سامع بیماریاں جس کا مقدر بن گئی ہیں۔ ڈیوڑھیوں پر دربانوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ راعی اور رعیت کے درمیان ہزاروں دیواریں کھینچ دی گئی ہیں۔ سامع سنتا ہے پاکستان اسلام کی بنیاد پر قائم ہوا ہے اسلام ہی پر قائم رہے گا۔ سامع کو یاد آتا ہے وقت آئے گا۔ جب زکوٰۃ دینے والے زکوٰۃ لے کر پھریں گے اور زکوٰۃ لینے والا کوئی نہ ہوگا۔"

لیکن سامع دیکھتا ہے: لوگ فٹ پاتھ پر دم توڑ رہے ہیں۔ دوائیں نہ ملنے کے سبب مریض زندہ درگور ہیں۔ زکوٰۃ کے مستحقوں سے سڑکیں، گلیاں اور شہر بھرے پڑے ہیں۔ زکوٰۃ دینے والے فلک بوس عمارات میں بہت اوپر، بہت بلند ہیں۔ وہاں تک کسی کی دسترس نہیں ہے کہ کل انہیں خدا کے سامنے جانا ہے۔ اپنی ذات کا احتساب اُس وقت سے پیشتر کیوں نہیں کر لیتے۔ جب لوگوں کے ہاتھ ان کے گریبان تک پہونچ جائیں گے۔"

سنو! سامع کا دل تڑپ رہا ہے۔ وہ ہمیشہ مجسمۂ اقرار بنا رہا۔ اس نے ہر آواز، ہر پیغام پر لبیک کہا۔ لیکن اب اس آخری آواز کے بعد صدیوں سے ایسی زبانوں سے پیغام سن رہا ہے جن کے لفظوں میں خوشبو نہیں ہے۔ سنو! سامع اب سنتے سنتے تھک رہا ہے۔ سنو، کان لگا کر سنو۔ سامع ہولے ہولے بول رہا ہے۔ وہ پوچھتا ہے کو وہ صفا سے جو ندا اُبھری تھی اس کو آگے لے کر چلنے والے کہاں گئے۔ آج فرات کے مسافر کہاں چلے گئے وہ بھرے مجمع میں پُوچھنا چاہتا ہے "عمر! یہ زائد کپڑا کہاں سے آیا۔"

سنو! اب سامع خود صدا بلند کرنا چاہتا ہے۔ سنو سامع مجسم احتجاج بن چکا ہے وہ منبر و محراب سے پیغام پہنچانے والوں کا دامن بھی پکڑنا چاہتا ہے کہ صدائے حق بلند کرنے والے کہاں گئے لوگ زکوٰۃ نہیں دے رہے ہیں۔ ان پر شکر کشی کیوں نہیں ہوتی۔ لوگوں نے اپنی ڈیوڑھیوں پر دربان بٹھا لئے ہیں۔ ان سے کوئی نہیں پوچھتا کہ وہ خدا کے سامنے کیا جواب دیں گے۔ سنو سامع اب پھر زائد کپڑے کا حساب مانگنے والا ہے۔ وہ دربان بٹھانے والوں سے خود پُوچھے گا۔ انہیں خود یاد دلائے گا کہ انہیں اللہ کے سامنے جواب وہ بھی ہونا ہے۔

سنو! سامع پوچھنے والا ہے کہ دریائے دجلہ کے کنارے ایک کتا اگر بھوکا مر جاتا تو عمرؓ کو خوف تھا کہ اُسے اس کا بھی حساب دینا ہوگا۔ اب فٹ پاتھوں پر انسان دم توڑ دیتے ہیں کوئی خوفزدہ نہیں ہوتا۔ کارخانے کا مزدور اپنی جان دے دیتا ہے کارخانے کے مالک کی آنکھ بھی نم نہیں ہوتی۔ سامع اب سامع نہیں رہے گا۔ سامع اس کا جواب مانگے گا۔ سامع بیم ورجا، یقین وگمان کی کشمکشوں سے آزاد ہونے والا ہے۔ سنو! سامع کہہ رہا ہے۔ وہ کوہ صفا سے آنے والی ندا کا پیغام خود سمجھ چکا ہے۔ اب وہ ادھر اُدھر صدا لگانے والوں کو نہیں سن سکتا۔ نہیں سن سکتا۔ آواز لگانے والے خاموش ہو جائیں یہ آوازیں انتشار پھیلا رہی ہیں۔ کرب پیدا کر رہی ہیں۔ اب وہ سنتا ہی نہیں رہے گا۔ اب وہ خود بولے گا۔ خود احتساب کرے گا۔

سامع جس کی جھونپڑی بارشوں میں بہہ جاتی ہے سامع جس کے بچے تعلیم اور روٹی دونوں سے محروم ہیں جس کے دل میں لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کے الفاظ دھڑکتے ہیں۔ سامع جس کی قوت ملوں کی چمنیوں سے دھواں بن کر فضا میں تحلیل ہوتی رہتی ہے۔ سامع جو زمین کا سینہ چیر کر زر برآمد کرتا ہے، اپنا حق مانگ رہا ہے۔ سامع اب احتساب چاہتا ہے۔"

سنو آواز آ رہی ہے کہ "جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔" اور سامع بھی اپنے آپ کو پہچاننے لگا ہے۔

سرمایہ داروں سے دَولت

جاگیرداروں سے

زمینیں

چھِن جائیں گی

ہے کوئی پاکستانی سرمایہ دار۔ جس کا دِل عوام کے لیے دھڑکتا ہو؟

عابد زبیری

آجکل "قومی سرمایہ دار" کی اصطلاح زبان زدِ عام وخاص ہے۔ اس کی من مانی تشریح اور تعبیر کی جا رہی ہے بعض کا کہنا ہے کہ جب سرمایہ داروں کے مفادات اور قومی مفاد ایک ہو جاتے ہیں تو سرمایہ داروں کا کردار قومی ہو جاتا ہے۔ کیا پاکستان میں قومی سرمایہ داروں کا وجود ہے؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ملے گا۔ کیونکہ پاکستان میں ایک بھی سرمایہ دار ایسا نہیں جس کے دل میں قوم کا درد ہو۔ اس کا دل عوام کے لئے دھڑکتا ہو اور اُس کے مفادات سامراجی مفادات سے مختلف ہوں۔

پاکستان کے تمام سرمایہ داروں کا مقصد صرف اور صرف غیر ممالک میں اپنے بنک بیلنسوں میں اضافہ کرنا ہے۔ مارشل لار کے ضابطے کے تحت بتائی ہوئی غیر ممالک میں بنائی جانے والی جائداد کی فہرست اس بات کی گواہی دے گی کہ پاکستان کے سرمایہ داروں نے کتنا سرمایہ دیارِ غیر میں منتقل کر دیا ہے۔ اگر یہ سرمایہ دار اپنے گریبانوں میں جھانکیں اور اعتراف کریں کہ کیا کسی موقع پر اپنے سرمائے کو ترقی دیتے وقت قومی مفادات کے مدِ نظر تھا۔ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہی ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں صرف طفیلی اور پھٹو سرمایہ دار ہیں۔ بین الاقوامی کمیونسٹ کانگریس ۱۹۲۸ء کے مقالے کے مطابق انہیں ہو گما شتہ سرمایہ دار" کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

حکومت کو دھوکا کون دیتا ہے؟ ٹیکس ادا نہ کرنے کے لئے حساب کتاب میں غلط اندراج کون کرتا ہے؟ کون زرمبادلہ کی چوری کرتا ہے؟ اوور انوائسنگ اور انڈر انوائسنگ کون کرتا ہے؟ ٹیکس سے بچنے کے لئے حکومت کو بتلائے بغیر کھڈیاں کون لگاتا ہے؟ اور حکومت کے واجبات کی ادائیگی کون نہیں کرتا ہے؟ سرمایہ دار اور صرف سرمایہ دار —— کیا یہی حُبّ الوطنی ہے؟ کیا یہ قوم پرستی ہے؟ ملک و عوام کی محبت کا تقاضا کیا یہی ہے کہ حکومت کو مالی نقصان پہنچایا جائے اور عوام و ملک کا استحصال کر کے اپنی تجوریوں کو بھرا جائے۔

مغربی امداد —— ایک فریب

پاکستان کا اُبھرتا ہوا سرمایہ دار طبقہ اپنی بقا اور ترقی کے لئے سامراجی امداد اور قرضے کا محتاج ہے۔ غیر ملکی امداد اور قرضے پر انحصار اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ پاکستانی سرمایہ دار کوئی اقدام بھی اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق نہیں اٹھا سکتے۔ سرمائے کی پیداوار غیر ملکی قرضوں کی مرہونِ منّت ہے —— مصنوعات کی فروخت کا انحصار کوٹے پر ہے جو کہ امریکی اور برطانوی سامراجی حکومتیں مقرر کرتی ہیں۔ فاضل پرزوں کیلئے ہماری صنعت مغربی ممالک کی محتاج ہے۔ ان حالات میں صنعتی ترقی کو قومی ترقی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

ایوبی حکومت نے ملک اور عوام پر سب سے بڑا ظلم یہ کیا کہ اُس نے پاکستان کی معاشی اور صنعتی ترقی کو امریکی سامراج سے منسلک کر دیا۔ اور پروپیگنڈہ کر دیا کہ ملک کی ترقی کا انحصار صرف غیر ملکی امداد اور قرضوں پر ہے۔ ایوب خان اور ان کے وزیرِ خزانہ مسٹر شعیب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی پاکستان کی صنعتی اور اقتصادی ترقی کے لئے عالمی بنک کی خوشنودی ضروری ہے۔ اور ہمیں چاہیئے کہ اس کے آگے جھولی پھیلائیں۔ اپنے صنعتی منصوبے اُس کے حضور میں پیش کریں۔ قرضوں اور فنڈ کے استعمال کی منظوری لیں۔ کنشورشیم پاکستان کی فریاد سنے گا اور صنعتی ترقی کے لئے بھیک دے گا۔ بشرطیکہ ہم ایک فرمانبردار اور برخوردار قوم کی حیثیت سے اس کے احکامات پر عمل کریں۔

پاکستان کے صنعتی منصوبے اور اُن کی تفصیل غیر صنعتی منصوبوں کی تفصیل اور ان کی اقتصادی مناسبت کی رپورٹ ہر سال کنشورشیم کو دی جاتی۔ اور اگر ان منصوبوں کو کنشورشیم کے اربابِ اقتدار مناسب سمجھتے تو فنڈ منظور کر دیئے جاتے۔ کنشورشیم کی اس امداد میں سیاسی جوڑ توڑ کا دخل ہونے کے علاوہ اس کی شرح سود بہت زیادہ لی جاتی اور پابندی عائد کی جاتی کہ تمام وہ سامان جو امدادی قرضوں سے خریدا جاتے نہ صرف یہ کہ امداد دینے والے ممالک سے خریدا جائے بلکہ اُن ہی کے جہازوں پر سے جایا جائے۔ امریکہ نہایت ناقص مشینری نہایت مہنگی دیتا اور اُس کی جہاز راں کمپنیوں کا کرایہ بھی زیادہ ہوتا۔ امدادی قرضے ان حقیر شرائط پر ملنے کے باوجود حکومت بہت خوشی مناتی، کنشورشیم میں پاکستان کی نمائندگی کرنے والے کی تعریف میں آسمان سے قلابے ملائے جاتے۔ وہ مسرت سے پھُولا اور پھُولوں سے لدا ہوا واپس آتا لیکن رومن شہنشاہ کی طرح نہیں۔ قصّہ مختصر، ایوبی دور میں پاکستان کی صنعتی ترقی امریکی سامراج کی طفیلی بن گئی اور صنعتی ترقی کی آزادی سلب ہو گئی۔

ہمارے سیٹھوں کی جان ۔ غیر ملکی سرمائے کے پنجرے میں بند ہے

تمام حکومتیں اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے ٹیکس عائد کرتی ہیں اور یہ ٹیکس عموماً ان طبقات سے لئے جاتے ہیں جن کو حکومت کی پالیسیوں سے فائدہ ہوتا ہے۔ جن کی آمدنی اور سرمائے میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن پاکستان میں ایوب خان کی حکومت نے اس اصول سے انحراف کرتے ہوئے سرمایہ داروں کو "ٹیکس ہالیڈے" دی۔ مزدوروں سے اجتماعی سوداکاری اور ہڑتال کا بین الاقوامی حق چھین لیا۔ ایوبی دور میں استحصال اپنی بدترین بھیانک شکل میں موجود تھا۔ ان تمام مراعات کے باوجود پاکستان کا ابھرتا ہوا سرمایہ دار طبقہ قومی سرمایہ دار کا کردار ادا کرنے میں قطعی ناکام رہا۔

پاکستان میں قومی سرمایہ دار طبقے کے وجود میں نہ آنے کی وجہ یہ ہے کہ جب سرمایہ دارانہ نظام میں سرمائے کی بنیادیں ملک سے باہر ہوں تو قومی سرمایہ دار وجود میں نہیں آتے۔ ابھرتی ہوئی سرمایہ داری کا بنیادی اور اولین کام جاگیرداری اور زمینداری کو ختم کرنا اور زمینوں کو چند خون چوسنے والے وڈیروں کے ہاتھوں سے لے کر کسانوں میں تقسیم کرنا ہوتا ہے تاکہ زرعی پیداوار میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ کسانوں کی قوت خرید میں اضافہ ہو کیونکہ زمینداری کو ختم کئے بغیر سرمایہ دار اپنی مصنوعات کے لئے مقامی کھپت پیدا نہیں کر سکتے۔ زمینوں کو تقسیم کر کے سرمایہ دار اپنے لئے ملکی منڈی پیدا کرتے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ بعض افراد پاکستان میں جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام کو ختم کرنے کے سلسلے میں زرعی اصلاحات کا حوالہ دیں۔ لیکن اگر ان زرعی اصلاحات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ اصلاحات محض ایک سیاسی ڈھونگ اور فریب تھیں۔ مغربی پاکستان میں بڑی بڑی زمینداریوں کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے خطہ اراضی بھی موجود ہیں چودہ ہزار قطعات ۱۵۰ ایکڑ یا اس سے زائد رقبہ کے ہیں جو کل زرعی زمین کا اعشاریہ تین صد اور زیر کاشت زمین کا دس فی صد ہیں۔ ۵۰۰ ایکڑ کے قطعات زرعی زیر کاشت زمین کا دو فی صد اور کل زرعی زمین کا ۲۳ فی صد ہیں۔ آٹھ فی صد زیر کاشت زمین ۲۵ ایکڑ یا اس سے زائد رقبے کے قطعات میں بٹی ہوئی ہے جو کل زرعی زمین کا ۳۴ فی صد ہے۔

مغربی پاکستان میں زرعی اراضی کی حد بندی

پاکستان کو جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام برطانوی نوآبادکاروں سے ورثہ میں ملا۔ ان جاگیرداروں اور زمینداروں کے مفادات سامراج سے وابستہ تھے۔ وہ ملکی اقتصادی اور صنعتی ترقی میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ ان مقابلے میں لاتعداد بے زمین کسان موجود تھے جو زرعی ترقی کے لئے زمین چاہتے تھے جبکہ پنجاب کے ایک زمیندار کے پاس ۳½ لاکھ ایکڑ زمین تھی۔ حکومت کے پاس زرعی اراضی نہیں تھی۔ اس لئے اس نے زرعی زمین کی حد بندی ضروری سمجھی۔ چنانچہ ۱۹۵۹ء میں مغربی پاکستان میں زرعی اصلاحات ہوئیں جن کے تحت ۳۶ ہزار پیداواری یونٹ یا ۵۰۰ ایکڑ نہری آبپاشی والی زمین یا ایک ہزار ایکڑ غیر نہری آبپاشی والی اراضی حد ملکیت مقرر کی گئی۔ اس کے علاوہ ۱۲ ہزار پیداواری یونٹ اپنے قریبی رشتے داروں اور ۱۵۰ ایکڑ اراضی باغات، چراگاہوں اور جانوروں کی افزائش نسل کے فرموں کے لئے رکھنے کی اجازت دی گئی۔ ان اصلاحات سے چھ ہزار زمیندار جن کے پاس نوّے لاکھ ایکڑ زمین تھی، متاثر ہوئے ان سے بیس لاکھ اور ۳۰ ہزار ایکڑ زمین حکومت نے لے لی۔ جاگیرداروں سے ۷۰ ہزار ایکڑ زمین ملی۔ اس طرح حکومت کو زرعی اصلاحات کی بدولت ۳۰ لاکھ ایکڑ زمین مل گئی۔ اور چھ ہزار بڑے زمینداروں کا حد ملکیت ڈیڑھ ہزار ایکڑ سے گھٹ کر ایک ہزار ایکڑ ہو گیا۔ جو زمین حکومت نے لی اس کا معاوضہ ۵ روپے سے ایک روپے فی پیداواری یونٹ کے حساب سے بونڈ کی شکل میں زمینداروں کو ادا کیا گیا۔ اس پر چار فی صد سود دیا گیا کل معاوضہ جو حکومت نے ادا کیا وہ ۱۶ کروڑ روپے تھا۔

زرعی اصلاحات ناکام ہو گئیں

زمینداروں نے نوکر شاہی سے ساز باز اور گٹھ جوڑ کر کے بے کار اور بنجر زمین حکومت کے حوالے کر دی اور اس کے عوض ۱۶ کروڑ روپے بھی وصول کر لئے۔ زمینداروں نے صرف ۶۰ ہزار ایکڑ زیر کاشت زمین حکومت کو دی۔ باقی ایک لاکھ ۲۰ ہزار ایکڑ اراضی بالکل بنجر اور بے آب و گیاہ تھی اور ۵۰ ہزار ایکڑ اراضی پہاڑوں اور جنگلوں میں واقع تھی۔ اس طرح ۲ فیصد قابل کاشت اراضی حکومت کو ملی۔ زرعی اصلاحات کے دس سال بعد حکومت مغربی پاکستان نے یہ انکشاف کیا کہ ۶۶ افراد کو اپنی زمین ٹھیکے پر رکھنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ لیکن ان سے ٹھیکے کی فیس تک نہیں لی گئی۔ اس کے علاوہ ضابطہ زرعی اصلاحات ۱۹۵۹ء کی دفعہ ۹ (ڈی) کے تحت ۲ لاکھ ایکڑ زمین جانوروں کی افزائش نسل کے فرموں، باغات اور کھیل کے میدانوں کے لئے زمینداروں کو دے دی گئی۔ اس طرح عوام دشمن نوکر شاہی نے زمینداروں سے گٹھ جوڑ کر کے زرعی اصلاحات کو بے اثر اور ناکام بنا دیا۔

مصنوعات کی برآمد کا افسانہ

یہ امر باعث دلچسپی ہو گا کہ ابھی تک پاکستان میں کوئی ایسے مستند اعداد و شمار مرتب نہیں کئے گئے جس سے صنعتی مصنوعات کی برآمدات اور فاضل پرزوں کی درآمدات کا تناسب ظاہر ہو سکے۔ کچھ عرصے قبل ایک انوسٹمنٹ کارپوریشن نے سرسری سروے کیا تھا اس کے مطابق مصنوعات کی برآمدات کے مقابلے میں فاضل پرزوں کی درآمد ۷۰ فی صد سالانہ سے بھی زائد تھی۔ اگر کپاس، سوتی کپڑے کی برآمد کے مقابلے میں غلے اور فاضل پرزوں کی درآمد اور غیر ملکی قرضوں پر سود کے اعداد و شمار کو دیکھا جائے تو پاکستان کی برآمدات اور ان کی ترقی محض ایک افسانہ بن جاتی ہے۔

پاکستان کے سرمایہ دار مکمل طور پر سامراجی چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ان کی تمام تر ترقی اور صنعتی ادارے امریکی سامراج کے مرہون منت ہیں۔ اس وجہ سے یہ سامراجی مفادات کی تکمیل سے پہلو تہی نہیں کر سکتے اور نہ ہی کوئی جداگانہ کردار کے حامل ہیں۔ اس لئے پاکستان میں قومی جمہوری سرمایہ داروں کے وجود کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

حکومت نے بنجر زمینوں کی قیمت ۱۰ کروڑ روپے ادا کی

غیر ملکی ایجنٹوں کی تعریف

دنیا کے جن ترقی پذیر ممالک میں امریکی سامراج اور بیرونی سرمایہ داروں نے سرمایہ کاری کی ہے وہاں قومی سرمایہ دار طبقہ پیدا نہیں ہو سکا۔ کیونکہ ان ممالک میں صنعتی ترقی کے باوجود نظام جاگیرداری اور زمینداری قائم ہے۔ جاگیردار اور زمیندار چونکہ سامراج کے خاص حواری اور پٹھو ہوتے ہیں اس لئے سامراج کے پروردہ سرمایہ دار اپنے آقا کے ایجنٹوں کا خاتمہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے ان ممالک میں نام نہاد قومی سرمایہ دار طبقے نے زمینداروں اور جاگیرداروں سے گٹھ جوڑ اور ساز باز کر لی ہے۔ دونوں کا یہ گٹھ جوڑ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ نام نہاد قومی سرمایہ دار زمینداری اور جاگیرداری کو ختم کرنے، عوام کو جاگیردارانہ دقیانوسی استحصال سے نجات دلانے اور قومی ذرائع سے قومی بنیادوں پر سرمایہ دارانہ ڈھانچہ تعمیر کرنے کا تاریخی کردار ادا کرنے سے قاصر ہے۔ دراصل ان ترقی پذیر ممالک کے سرمایہ دار اور یہ نام نہاد سرمایہ دار اگر قومی سرمایہ دار کا نقاب پہن بھی لیں تب بھی کوئی ترقی پسندانہ اقدام نہیں کر سکتے۔ اس لئے قومی جمہوری نظام کی جدوجہد میں ان کو اپنے ساتھ لینے اور ان سے تعاون کی امید رکھنا محض خام خیالی اور حماقت ہے۔

جنگ عظیم کے بعد کا سامراج

پاکستان کے سرمایہ دار طبقے کے کردار کی وضاحت کے لئے ضروری ہے کہ ان تبدیلیوں کا جائزہ لیا جائے جو جنگ عظیم دوم کے بعد سامراج نے اپنی پالیسیوں میں کی ہیں۔ یہ تبدیلیاں نہایت اہم ہیں اور کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ جنگ عظیم دوم کے بعد سامراجی پالیسی میں جو بنیادی اور اہم تبدیلی آئی وہ یہ کہ بلاواسطہ استحصال کی بجائے بالواسطہ استحصال کیا جائے۔ بالواسطہ استحصال کے لئے امدادی قرضوں کا طریقہ اپنایا گیا۔ سامراجیوں نے براہ راست اور اپنے مقامی ایجنٹوں کے ذریعے یہ زبردست پروپیگنڈہ کیا کہ نو آزاد ممالک کا چلنا تو درکنار یہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہیں۔ اس لئے ان ممالک کو بھاری امداد کی سخت ضرورت ہے۔ اس طرح امدادی قرضوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ترقی یافتہ ممالک کے سامراجیوں نے پہلے پہل بڑی مکاری سے کم سود پر قرضے دیئے جب ان ممالک پر قرضہ کافی ہو گیا تو شرح سود میں اضافہ کرنے کے علاوہ ادائیگی کی مدت اور استعمال کی شرائط کڑی کر دیں۔ اس طرح ان ممالک کا استحصال نہایت تیز ہو گیا۔ پاکستان صنعتی ترقی کے لئے اس وقت تک ۵ ارب ۱۵ کروڑ اور نوے لاکھ ڈالر کے امدادی قرضے مختلف سامراجی ممالک سے لے چکا ہے۔ جبکہ پاکستان کو غیر ملکی تجارت میں ۸۱ کروڑ ڈالر کا خسارہ ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سامراجی ممالک ترقی پذیر ممالک کا مال نہایت سستا خریدتے ہیں۔ اور ہر سال ان کے مال کی قیمت میں کمی کرتے رہتے ہیں۔ جب کہ اپنے مال اور مشینری کی قیمتوں میں مسلسل اضافہ کرتے جا رہے ہیں۔ اس کا مطلب صاف یہ ہے کہ سامراجی ممالک ایک ہاتھ سے دیتے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے واپس لے لیتے ہیں۔

سامراج ترقی پذیر ممالک کے استحصال سے ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہے۔ ابتدا میں سامراجیوں نے براہ راست حکومت کے لئے ممالک فتح کئے وہاں کے عوام کو اپنا غلام بنایا اور وہاں کے ذرائع پیداوار اور معدنی وسائل اور عوام کا بلاواسطہ استحصال کیا۔

سرمایہ داروں، زمینداروں اور جاگیرداروں نے آپس میں گٹھ جوڑ کر رکھا ہے

پرانے سامراجی نظام میں نوآبادیات سامراج کے لئے سیم و زر کی کانیں تھیں۔ بقول لارڈ میکالے کے "دولت کے دریا ہندوستان سے انگلستان کی طرف رواں تھے" نوآبادیاتی معدنی وسائل سامراجی ممالک کی صنعتی اور اقتصادی ترقی کے کام آتے تھے۔ لیکن جنگ عظیم دوم کے بعد سامراج نے اپنی پالیسی میں تبدیلی کی اور بلاواسطہ استحصال کی بجائے بالواسطہ استحصال کا طریقہ اپنایا۔ یہ نکتہ نہایت اہم ہے۔ اگر اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سامراجی اداروں کے ذریعے ترقی پذیر ممالک میں سرمائے کی توسیع اور صنعتی ترقی ہو رہی ہے۔

ترقی پذیر ممالک کے بالواسطہ استحصال کے ساتھ ساتھ ترقی یافتہ ممالک کا جائزہ لینا بھی از حد ضروری ہے۔ کہ سامراجی ممالک اپنی "قدر زائد" ترقی پذیر ممالک اور اپنے عوام کے استحصال سے حاصل کیا ہوا منافع کہاں خرچ کرتے ہیں؟ سرمایہ دارانہ معیشت میں "معاشی بحران" ناگزیر ہوتے ہیں۔ ان بحرانوں سے بچنے کے لئے سامراجی ممالک اپنی "قدر زائد" کو جنگی معیشت پر خرچ کر دیتے ہیں۔ ماہر اقتصادیات کینز نے معاشی بحرانوں سے بچنے کا واحد طریقہ "حکومت کے اخراجات" اور جنگی معیشت بتایا تھا۔ گولہ بارود اور اسلحہ کی صنعت کیونکہ انتہائی صرف پیدا نہیں کرتی۔ اس لئے اس کی پیداوار کا ملکی معیشت پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ امریکہ، برطانیہ اور فرانس میں اسلحہ سازی کے کارخانوں پر بڑے بڑے سرمایہ داروں کی اجارہ داریاں ہیں۔ اس کے باوجود حکومتیں انہیں مالی امداد دیتی ہیں۔ کیونکہ اس طرح حکومت اپنی قدر زائد خرچ کرنا چاہتی ہے۔ معاشی بحران سے بچنے کے لئے ترقی یافتہ ممالک نے اپنی معیشت کو جنگی معیشت میں ڈھال لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ ایک طرف تو ایٹم بم بنا رہا ہے، چاند پر کمندیں ڈال رہا ہے۔ دوسری جانب کروڑوں امریکی انتہائی غربت اور کسمپرسی کے عالم میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

سامراجی ترقی پذیر ممالک کو صرف وہی صنعتیں لگانے کی اجازت دیتے ہیں جن سے امداد دینے والے ممالک متاثر نہ ہوں۔ صنعتی امدادی قرضوں کا مقصد دراصل ترقی پذیر ممالک کی قوت خرید میں اضافہ کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ سامراجی ممالک کی غیر پیداواری اشیاء جیسے وہ "قدر زائد" سے پیدا کرتے ہیں۔ یعنی آلات حرب خرید سکیں۔

غیر ملکی قرضے — قوم کو گروی رکھنا

سامراجی اپنا اسلحہ گولہ بارود ترقی پذیر ممالک کو

۵ ارب ۱۶ کروڑ ڈالر کے امدادی قرضے، اور غیر ملکی تجارت میں ۸۱ کروڑ ڈالر کا خسارہ

فروخت کرنے کے لئے امدادی قرضوں کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ حالانکہ ان امدادی قرضوں کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ ترقی پذیر ممالک تھوڑی بہت ترقی کر کے سامراجی ممالک سے آلات حرب خریدنے کے قابل ہو جائیں۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں امریکی سامراج نے پاکستان کی صنعتی ترقی کے لئے جو امدادی قرضے دیئے اس سے ترقی کی بجائے ملک اقتصادی بحران، افراط زر وغیرہ کا شکار ہو گیا۔

پاکستان میں سامراجی سرمائے کی درآمد اور سرمایہ کاری اپنی انتہا پر پہنچی ہوئی ہے۔ اس سامراجی سرمایہ کاری کا مقصد زیادہ منافع کمانا ہے۔ کیونکہ اس سرمائے پر جو سود لیا جاتا ہے اس کی شرح برطانوی، امریکی اور فرانسیسی بنکوں کی مُلکی شرح سود سے زیادہ ہے۔ امریکہ میں شرح سود ½۶ فی صد سالانہ ہے جبکہ پاکستان سے ۷ فی صد سالانہ کے حساب سے سود لیا جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اگر یہ مغربی سامراجی ممالک امدادی قرضوں کو بند کر دیں اور اپنے ملک ہی میں سرمایہ کاری کریں تو ان کے اپنے ملک میں شرح سود گھٹ جائیگی ترقی پذیر ممالک کو مرکب سود پر امدادی قرضے دیئے جاتے ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں پاکستان کو ۳ء۵ فیصد سالانہ شرح سود پر امداد دی گئی جو مرکب شرح سود کی وجہ سے ۱۹۶۸ء میں ½۱۹ فیصد سالانہ ہو گئی۔ لیکن امدادی قرضوں اور غیر ملکی سرمایہ کاری کا سب سے محرک سیاسی سبب ہے۔ تاکہ نام نہاد "آزاد دنیا" کو اپنی گرفت میں رکھیں۔ سامراجی اور ترقی یافتہ ممالک پرانے نظام نو آبادیات کے ذریعے ترقی پذیر ممالک کا استحصال کرنے کی بجائے بمبوجیٹ، آلات حرب، ریڈار، الیکٹرونک کا گراں بہا سامان وغیرہ ترقی پذیر ممالک کو من مانی قیمتوں پر فروخت کر کے استحصال کرتے ہیں۔ یہ جاننا دلچسپی کا باعث ہوگا کہ ایک بمبوجیٹ کی قیمت دس پٹ سن کے کارخانوں کے برابر ہوتی ہے۔

بین البراعظمی میزائلوں کی ایجاد کے بعد سامراجی ممالک ترقی پذیر ممالک میں اپنے فوجی اڈے برقرار رکھنے اور تعمیر کرنے کے سلسلے میں دلچسپی کم کرتے جا رہے ہیں۔ کیونکہ ان میزائلوں سے اپنے ہی ملک میں بیٹھے بیٹھے اپنے دشمن ملک کو تباہ و برباد کر سکتے ہیں۔ ان حالات میں امدادی قرضوں کا مقصد صرف سیاسی ہی رہ جاتا ہے۔

امریکی سامان حرب کی فروخت کو فروغ دینے میں امریکی سی آئی اے کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ اس نے جاسوسی اور ترقی پذیر ممالک کو آپس میں لڑانے، غنڈہ گردی اور محب وطن حکمرانوں کو سازش کے ذریعے بدنام اور محروم اقتدار کرنے کے لئے وسیع جال پھیلا رکھا ہے۔ ترقی پذیر ممالک کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کرنا اور لڑوانا اس کا کام ہے۔ اس کے پیچھے کارفرما مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی صنعتی اور اقتصادی ترقی پر سرمایہ لگانے کی بجائے دفاعی اخراجات پر زیادہ خرچ کریں۔ امریکہ سے اسلحہ، گولہ بارود اور طیارے خریدیں۔ اور سامراج کی استحصالی گرفت سے نکلنے نہ پائیں۔ مشرق وسطیٰ اس کی روشن اور زندہ مثال ہے۔ مشرق وسطیٰ میں تمام ممالک "پُرامن حل" اور "دیرپا امن" کے متلاشی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود سامراجی ممالک اسرائیل کو اسلحہ پر اسلحہ دے رہے ہیں اور عربوں کو بھی اسلحہ فروخت کر رہے ہیں۔

سامراج پر مکمل انحصار

سامراجی امدادی قرضوں پر پلا ہوا پاکستانی سرمایہ دار طبقہ سامراج کے استحصالی نظام کا ایک کل پرزہ ہے۔ یہ سامراجی اشارے کے بغیر حرکت تک نہیں کر سکتا۔ پاکستان میں سوتی پارچہ جات اور پٹ سن کی صنعت سب سے بڑی ہیں۔ ان دونوں کی بقاء اور ترقی کا انحصار سامراج پر ہے۔ اگر آج امریکہ اور برطانیہ ٹیکسٹائل کی مصنوعات کا کوٹہ کم کر دیں یا ختم کر دیں تو پاکستان کی ٹیکسٹائل انڈسٹری ایک دم تباہ ہو جائے گی۔ یہی حالت پٹ سن کی مصنوعات کی ہے۔ اگر سامراجی ممالک پٹ سن کی مصنوعات کی درآمد بند کر دیں تو جوٹ ملوں کو بند کرنا پڑے گا یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پٹ سن کا نعم البدل دستیاب ہو گیا۔ یہ نعم البدل پٹ سن کی صنعت کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ پاکستان کو دوسرے غیر ممالک میں منڈیاں تلاش

صرف محنت کش ہی محنت کشوں کو آزادی دلا سکتے ہیں

کرنے کی اجازت بھی نہیں دی جاتی۔ یہاں اس بات کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ ڈاکٹر سوکارنو کے زوال کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انہوں نے عوامی جمہوریہ چین کے کہنے پر پاکستانی ٹیکسٹائل کی مصنوعات انڈونیشیا کو برآمد کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ انڈونیشیا میں پاکستانی مصنوعات کی درآمد سے سامراجی مصنوعات کی کھپت میں کمی ہو گئی۔ اس لئے سی آئی اے نے ڈاکٹر سوکارنو کو محروم اقتدار کرنے کے لئے اپنا عمل تیز کر دیا۔

جب پاکستان کے سرمایہ دار، سامراج کے پٹھو اور اس کے ایجنٹ ہیں تو قومی جمہوری انقلاب میں ان کی مدد یا تعاون کی امید رکھنا فضول سی بات ہے۔ اس لئے پاکستانی عوام کی پوری جدوجہد سامراج اس کے مقامی سرمایہ دار ایجنٹوں کے خلاف ہے۔ جو عوام کا استحصال کرنے کے لئے جاگیردارانہ قیادت اور جاگیردارانہ نظام کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ سامراج دشمنی کے معنی ہیں کہ سامراج کے مقامی حواریوں اور ایجنٹوں کے خلاف جدوجہد کی جائے جو اس کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔

۲۲ خاندان اور طبقاتی جدوجہد

پاکستانی عوام کی طبقاتی جدوجہد کو سبوتاژ کرنے کے لئے سی آئی اے نے اسٹیٹ بنک کے ذریعے یہ بات پھیلائی کہ ۲۲ خاندانوں نے سرمائے کا ارتکاز کر لیا ہے اور اجارہ داریاں قائم کر لی ہیں۔ ارتکاز دولت کے خلاف اور مشرقی پاکستان کے چھوٹے سرمایہ داروں کے تحفظ کے لئے بڑی زور شور سے مہم چلائی گئی۔ حالانکہ سرمایہ دارانہ نظام کا یہ خاصہ ہے کہ سرمایہ چند ہاتھوں میں جمع ہو جاتا ہے بڑا سرمایہ دار چھوٹے سرمایہ دار کو ہڑپ کر جاتا ہے لیکن یہاں تجزیہ کرتے وقت حق قومیت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ حق قومیت مقدم ہے۔ لیکن ہمارے ہاں حق قومیت کو اتنا ابھار دیا جاتا ہے کہ وہ عوامی طبقاتی جدوجہد پہ غالب آجاتا ہے۔ اور طبقاتی جدوجہد کو سخت نقصان ہوتا ہے حالانکہ طبقاتی جدوجہد ہی قومیتوں کو معاشرے میں مناسب مقام دلاتی ہے۔ بعض کلاسیک کا کہنا ہے کہ "انقلاب کی نوعیت" دو "استحصال کی نوعیت" سے متعین کی جاتی ہے۔ ان کے مؤقف کے مطابق مغربی پاکستان نے مشرقی پاکستان کا استحصال کیا ہے۔ اس لئے مشرقی پاکستان کا انقلاب "قومی جمہوری سرمایہ دارانہ انقلاب" ہوگا۔ ان نظریات کی وجہ سے بعض لوگوں نے مشرقی پاکستان کے سرمایہ داروں کے لئے کام کرنا شروع کر دیا۔ مغربی پاکستان کے نام نہاد اجارہ دار سرمایہ داروں کے خلاف نفرت پھیلائی۔ اور اس طرح طبقاتی جدوجہد پس پردہ چلی گئی۔ ان افراد نے انقلاب کا پہلا نشانہ سامراج کی بجائے مغربی پاکستان کے نام نہاد اجارہ دار سرمایہ داروں کو بنایا اور یہ سوچنے کی زحمت نہیں کی کہ اجارہ دار سرمایہ داروں کے بارے میں اطلاعات کے ذرائع کون سے ہیں۔

اس موقع پر کلاسیک نے ایک معاشرے میں سرمائے کے ارتقاء کے قوانین کو نظرانداز کر دیا سرمایہ دارانہ معاشرے کے آجر کے کردار کو بھول گئے اور یہ بھی نظرانداز کر دیا کہ سرمایہ دارانہ نظام

ہم سے سُود کی شرح، برطانوی، امریکی اور فرانسیسی بنکوں کی شرح سُود سے بھی کہیں زیادہ ہے

اور سرمائے کے ارتقاء کے اپنے قوانین ہوتے ہیں اور کوئی بھی حکومت ان قوانین کو عمل پیرا ہونے سے نہیں روک سکتی۔ ہمارے خیال میں پاکستان کے کسی بھی صوبے میں قومی جمہوری سرمایہ دارانہ انقلاب کے امکانات نہیں۔ کیونکہ سرمایہ داروں نے جاگیرداروں اور زمینداروں سے گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔

پاکستانی عوام کو صرف سوشلسٹ انقلاب کے لئے کام کرنا ہے۔ اور اس کے لئے طبقاتی جدوجہد اولین اور بنیادی شرط ہے۔ یہ ہمارا عقیدہ ہے کہ سوشلزم صرف اور صرف مزدوروں کی قیادت میں کسانوں، مزدوروں اور عوام کی جدوجہد سے ہی آسکتا ہے۔ اس لئے بنیادی فرض یہ ہے کہ عوام کے ذہنوں میں سوشلسٹ اور انقلابی نظریات پیدا کئے جائیں۔ عوام کو سوشلسٹ انقلاب کی راہ سے ہٹانے کا مطلب عوام سے غداری کے مترادف ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ محب وطن اور عوام دوست طاقتیں آگے بڑھیں، منظم ہوں اور اس تاریخی اور مقدس فریضہ کو انجام دیں۔

پاکستان ایک زرعی ملک ہے۔ کوئی انقلابی اقدام اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کھیت مزدوروں، ہاریوں اور کسانوں کو انقلابی نظریات سے آگاہ نہیں کیا جاتا۔ اور ان میں عوامی ابھار پیدا نہیں کیا جاتا۔ کسانوں میں انقلابی روح سموئے بغیر انقلاب نہیں لایا جا سکتا۔ اور یہ کام صرف ایک منظم جماعت ہی کر سکتی ہے۔ جس کی قیادت محب وطن، مخلص اور انقلابی مزدوروں کے پاس ہو۔ صرف ایسی ہی قیادت کسانوں اور عوام میں انقلابی روح پھونک سکتی ہے۔ اور عوام کو جاگیرداروں، سرمایہ داروں کی قیادت سے نجات دلا سکتی ہے۔ میں یہاں کارل مارکس کا یہ قول دہرانا پسند کروں گا کہ "صرف محنت کش ہی محنت کشوں کو آزادی دلا سکتے ہیں" اس کے علاوہ عوام کی آزادی کا دوسرا طریقہ ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا ہے۔

بعض لوگوں نے مزدوروں اور کسانوں کو ٹریڈ یونین ازم اور کسان کمیٹیوں کے علاوہ سرمایہ دارانہ سیاست میں بھی ملوث کر دیا۔ یہ انتہائی غلطی تھی۔ کسانوں اور مزدوروں کو کسان کمیٹیوں اور ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں میں حصہ لینا چاہئے لیکن بورژوا سیاست میں ملوث نہیں ہونا چاہئے۔

ہمیں یقین کامل ہے کہ پاکستان کے باشعور اور محب وطن مزدور اور کسان اپنا تاریخی فریضہ انجام دیں گے، استحصال کا خاتمہ اور غیر طبقاتی معاشرہ قائم کریں گے۔ پاکستان میں ایک دن سوشلسٹ انقلاب ضرور آئے گا۔ کیونکہ یہ تاریخ کا اٹل فیصلہ ہے سوشلزم عوام کا مقدر بن چکا ہے لیکن سوشلسٹ انقلاب صرف اور صرف مزدوروں کی قیادت میں ہی آئے گا۔



ولیکا سیمنٹ سے تعمیر کیجئے

تعمیرات کی پائیداری اور نفاست کے لئے ولیکا سیمنٹ ضروری ہے۔ عالمی معیار کے مطابق تیارشدہ، ولیکا سیمنٹ کا ہر ذرہ استحکام و پائیداری کا مظہر ہے۔ اِسی لئے ماہرین تعمیرات ہمیشہ ولیکا سیمنٹ پر اعتماد کرتے ہیں۔



ولیکا سیمنٹ

ORIENT

اظہارِ خیال

یونانی معیشت کا ڈھانچہ غلاموں کے استحصال پر کھڑا کیا گیا

جمہوریت

ظفراللہ پوشنی

جمہوریت کیا ہے؟

ایک ایسے وقت میں جبکہ لفظ جمہوریت ایک مقبول عقیدہ کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اگر کسی سے سوال کیا جائے تو وہ اپنی روح کی گہرائیوں میں اس کے بارے میں یقیناً کچھ محسوس کرے گا مگر اس کی وضاحت میں وہ تامل کرے گا۔ دراصل بیسویں صدی کی سب سے منفرد اور ممتاز علامت یہی ہے کہ ہر شخص جمہوریت کی مالا جپتا ہے۔ لیکن چند ہی لوگ اس پر عمل کرتے ہیں۔ جدی شاہان اور اجارہ دار سرمایہ دار، ڈکٹیٹر اور فاشسٹ، کمیونسٹ اور نراجی، انقلابی اور رد انقلابی سب کے سب خود کو جمہوریت کی 'زلفِ پیچاں' کے اسیر قرار دیتے ہیں اپنے آپ کو سچا جمہوریت پسند کہتے ہیں۔ ان کے مخالفین بھی جمہوریت پسندی کا دعویٰ کرتے ہیں اور جمہوریت پسندوں کی غیر جمہوری کارروائیوں کا پردہ چاک کر کے انہیں 'جمہوریت کے دشمن' کے نام سے پکارتے ہیں۔

جمہوریت بلاشبہ بیسویں صدی میں خیر و شر کو پرکھنے کی ایک کسوٹی ہے۔ حتیٰ کہ غیر سیاسی عام شہری بھی جمہوریت کے بارے میں اس طرح سے گفتگو کرتے ہیں جیسے وہ اسکی پیچیدگیوں کا بحسن خوبی ادراک رکھتے ہوں۔ چند ہی لوگ ایسے ہوں گے جو دلائل اور پورے ربط کے ساتھ اس کا مفہوم اچھی طرح ادا کر سکیں۔ جمہوریت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ہم یہ سمجھیں کہ جمہوریت کسے کہتے ہیں اور اس کا کیا مطلب ہے؟

دورِ اوّلین کی سوسائٹی کا ہر گروپ اپنا ایک لیڈر رکھتا تھا۔ وہ لیڈر عام طور پر اس گروپ کا سب سے طاقتور مرد ہوتا۔ لیڈر اپنی جسمانی قوت اور جرأت کے ذریعہ گروپ کے اندر نظم و ضبط قائم رکھتا۔ اس پر اس کے جتھے کے تحفظ اور بیرونی دشمنوں سے انہیں خبردار رکھنے کی ذمہ داری عاید تھی جتھے کے عام لوگوں کی نسبت اُسے زیادہ مراعات حاصل ہوتے۔ اس کی خدمت کے لئے کئی عورتیں مقرر ہوتیں۔ وہ آسودہ حال زندگی بسر کرتا۔ اس قدیم اور سادہ سوسائٹی (جسے وہ قدیم کمیونزم کی اصطلاح دیتے ہیں) مساوات، اخوت، اجتماعی ملکیت اور جمہوریت کی وجہ سے نمایاں ہے۔ کوئی شخص اس نقطہ نظر سے اختلاف کر سکتا ہے اختلاف کا یہ حق منظور کرتے ہوئے اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قدیم سوسائٹی میں نجی جائیداد رکھنے کا حق نہ تھا۔ کیونکہ ہر شخص کو جنگلوں سے شکار اور دریاؤں سے مچھلیاں پکڑنے کی پوری آزادی تھی اور یہ دونوں چیزیں کسی کی نجی املاک میں شامل نہ تھیں۔ یہ بات بھی تسلیم کر لی جائے کہ سماج میں طبقات نہ تھے۔ نہ کوئی امیر تھا نہ کوئی غریب۔ نہ آقا نہ غلام، نہ بادشاہ نہ رعیت یہ ساری باتیں تسلیم، اس کے باوجود یہ سوسائٹی جمہوری سوسائٹی نہ تھی۔ یہ سوسائٹی جمہوری اس لئے نہ تھی کہ اس میں 'عوام کی حکومت' نہ تھی۔ طاقت کا سرچشمہ طاقتور چیف یا لیڈر تھا۔ جسے ووٹوں کے ذریعہ منتخب نہیں کیا جاتا بلکہ وہ اقتدار کی کرسی پر اس وجہ سے متمکن تھا کہ اس نے اپنی غیر معمولی طاقت اور جرأت و ہمت سے دوسروں کو اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح قدیم قبائلی سوسائٹی کو جمہوری سوسائٹیوں کی کیٹیگری سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔

زیادہ غلہ جمع کرنے کی معیشت سے زیادہ غلہ پیدا کرنے کی معیشت کے دوران انسانی اداروں میں غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مویشی اور زمین کو نجی املاک میں شامل کر لیا گیا۔ تقسیم محنت، تجارت کی مختلف شکلوں میں مہارت اور طبقات کی تشکیل۔ یہ سب کچھ 'غلہ اگاؤ' معیشت کے دوران انسان کی ذہانت کے کمالات نمایاں ہیں۔ قدیم سوسائٹی میں دشمن کو غلام بنانے کا رواج نہ تھا۔ ہر شخص کو اپنی غذا کے لئے شکار کرنے اور مچھلیاں پکڑنے کی آزادی تھی۔ 'فاضل پیداوار' کی نہ تو حاجت تھی اور نہ ہی یہ ممکن تھا۔ زراعت کی ترقی کے ساتھ ہی دوسروں کو غلام بنانا ایک منافع بخش کاروبار ثابت ہوا۔ غلاموں کو کام کرنے پر مجبور کیا گیا اور دوسروں کی محنت سے اضافی پیداوار سے لطف اندوز ہونے کی رسم چل پڑی۔ اس طرح "تاریخ کا وہ دور شروع ہوا جب مصر میں فرعونوں کی عظیم الشان سلطنت کا سارا بوجھ غلاموں کے کندھوں پر رکھا نظر آتا ہے۔ بعینہٖ چین، شام، میسوپوٹامیہ، بابل اور ہندوستان میں بھی دورِ غلامی کی مثالیں ملتی ہیں۔ ظاہر ہے فرعونوں کے مصر اور اس عہد کی دوسری سلطنتوں کو ہم کسی طرح بھی 'جمہوریت' کا نام نہیں دے سکتے۔

یونان میں کچھ عرصہ بعد ایک مختلف صورتحال جنم لیتی ہے۔ یہاں سوداگروں اور تاجروں نے متعدد آزاد شہری ریاستیں قائم کر دی تھیں —— یونان کی یہ شہری ریاستیں انسان کے علم و آگاہی کا مرکز اور ثقافتی سرگرمیوں کا گہوارہ بن گئیں۔ انہی ریاستوں میں لافانی سقراط، افلاطون اور ارسطو اور سینکڑوں شاعر، سنگتراش، ڈرامہ نویس ناول نگار، سائنسدان، ریاضی دان، ڈاکٹر اور سیاسی جینئس پیدا ہوئے لیکن اس زرنگار پردے کے عقب میں بھی غلامی کا وہی تکلیف دہ نظام موجود تھا۔ پوری سوسائٹی آزاد شہریوں اور غلاموں پر مشتمل تھی۔ آزاد شہری کو رائے دہی اور اپنے نمائندے منتخب کرنے کا حق تھا۔ جبکہ غلاموں کو صرف محنت کرنے اور ننگی پیٹھ پر دُرّے کھانے اور سسک سسک کر مرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ آبادی کی اکثریت غلاموں کی تھی۔ آزاد شہریوں کی تعداد بہت مختصر تھی۔ اس کے باوجود یونان کی شہری ریاستوں کو

جنگ عوام نے جیتی، حاکم سرمایہ دار بن بیٹھے

جمہوری حکومت کی ابتدائی شکل کا نام دیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ انسان کا پہلا تجربہ تھا جس کی معیشت کا ڈھانچہ غلاموں کے استحصال پر کھڑا کیا گیا۔

فرعونوں کے عہد سے لے کر تقریباً تین ہزار سال تک متمدن دنیا کا ایک بڑا حصہ غلامی کے ظالمانہ نظام میں جکڑا رہا۔ بالخصوص مصر میں صدیوں تک پوری قوم کے گلے پر فرعونوں کی گرفت مضبوط رہی ظلم کی اس چکی میں پستے ہوئے صدیاں بیت گئیں۔ ایک بار پھر ہوا کا رخ تبدیل ہوا۔ دست کاری کے فن میں نئی تبدیلیاں ہوئیں۔ نئے اصول وضع ہوئے۔ زراعت کی نئی تیکنک اور نئے نظریات نے غلاموں کو ختم کر دیا۔ اور ان کی جگہ ایسے غلاموں نے لے لی جن کی خدمت زمین کے ساتھ منتقل ہونے لگی۔ اس طرح جاگیردارانہ نظام پیدا ہوا۔ اس نظام کا مشرق و مغرب دونوں جگہوں میں بہت دیر تک تسلط قائم رہا۔ اس ایٹمی دور میں بھی بے شمار جگہوں میں یہ ظالمانہ نظام پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ و سلامت ہے۔

جاگیرداری

زرعی معیشت میں جاگیردارانہ نظام کو حاکمانہ غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں سب سے اہم ذرائع پیداوار یعنی زمینیں آبادی کی ایک اقلیت میں بٹی ہوتی ہیں اور بقیہ تمام زمینوں کے مالک بڑے بڑے زمیندار ہوتے ہیں۔ عہدِ وسطیٰ اور بیسویں صدی میں جاگیردار ملکوں کا حکمران طبقہ دراصل جاگیردار طبقہ ہی ہوتا ہے یا حکومت جاگیرداروں کے زیرِ اثر ہوتی ہے۔ ان جاگیردارانہ ملکوں میں جمہوریت کی توقع یا تلاش محض ایک مذاق ہوگا۔ کیونکہ ان کی سوچ اور خیالات صاف اور واضح ہیں۔ ان کے نزدیک عوام کو ان کے مقام پر رکھنا چاہیئے یعنی عوام کا کام شرفاء کی خدمت اور ان کا وفادار رہنا ہے۔

جاگیردارانہ سماج میں کسانوں کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ ہوتی ہے، ناقابلِ برداشت حالتِ کار میں انہیں کام کرنا پڑتا ہے۔ غربت انہیں بے رحمی سے پیس ڈالتی ہے۔ ان کے مالک و مختار جاگیردار ہیں۔ کسانوں کی زندگی انہی جاگیرداروں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ اگر کبھی جاگیرداروں کا ظلم و ستم ناقابلِ برداشت بن جاتا ہے۔ تو پھر ان کے خلاف بغاوت پھوٹ پڑتی ہے مگر ایسی بغاوتیں عام طور پر ناکام ہو جاتی ہیں اور یہ ناکامی کسانوں پر مزید ظلم و ستم کے دروازے کھول دیتی ہے۔

جاگیرداروں کا طویل تسلط، ایک بے لگام استبدادی حکومت اور براہِ راست استحصالی دور کا نام ہے۔ ایسے ملکوں اور علاقوں میں جہاں جاگیردارانہ معیشت ہے وہاں جمہوریت کا ہلکا سا شائبہ بھی نہیں ملے گا۔

یورپ کے صنعتی انقلاب سے جمہوری حکومت کا نظریہ سامنے آیا۔ اس کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ ۱۷ویں صدی کے دوران برطانیہ، فرانس اور یورپ کے دوسرے ترقی پذیر ممالک کے تاجر طبقے اپنے وسائل سے بے پناہ دولت سمیٹ رہے تھے۔ نئی ایجادات کی بدولت صنعتوں کو فروغ حاصل ہو رہا تھا اور متوسط صنعتکار طبقہ تیزی سے ابھر رہا تھا۔ تاجروں اور صنعت کاروں کا یہ طبقہ حریف جاگیرداروں کے مقابلے میں اپنے گرد و پیش کے حالات سے زیادہ باخبر تھا۔ ان کی نگاہیں پیداواری ذرائع کے ساتھ ملک کے نظم و نسق پر بھی تھیں لیکن ان کا طاقتور حریف جاگیردار طبقہ ان کے راستے میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ چنانچہ دونوں طبقوں میں حصولِ اقتدار کی جنگ چھڑ گئی۔

بورژوا طبقے نے اپنے حامیوں کی مدد سے پرانے جاگیردارانہ سماج کے خلاف ایک بھرپور مہم شروع کر دی۔ عوام جاگیرداروں کے ستائے ہوئے تھے۔ انہیں بے شمار

امریکہ میں انتخابات

کارنیوال شو کی طرح

منائے جاتے ہیں

ظالمانہ پابندیوں میں جکڑ دیا گیا تھا۔ بورژوا طبقہ کی شروع کی گئی مہم سے ان کا متاثر ہونا ایک یقینی امر تھا۔ مظلوم عوام کو سیاسی اور سماجی حقوق کی امید دلائی گئی۔ ایسی گھٹن میں یہ نعرہ ہوا کا ایک خوشگوار جھونکا ثابت ہوا۔ ایک نئی سوسائٹی جس میں انسان اپنی مرضی کے مطابق کام کرے۔ جب چاہے آرام کرے۔ اسے لیورپول یا لندن کہیں بھی رہنے کی آزادی ہو۔

بورژوائی آزادی، اخوت اور مساوات کے دلفریب نعرے لے کر آئے تھے۔ نئے عہد کے دانشور والٹیئر اور روسو انسان کی مکمل آزادی کا گیت گا رہے تھے۔ "انسان آزاد پیدا ہوا" روسو پوری طاقت سے چیختا ہے "لیکن ہر جگہ اسے پابندیوں میں جکڑ دیا گیا"۔ یورپ کے عوام جو عرصۂ دراز سے عزت مآب شرفاء اور جاگیرداروں کے انسانیت سوز مظالم کے شکار تھے۔ وہ ان نعروں سے مسحور ہو کر بورژوا کے گرد جمع ہو گئے۔ آزادی کا پرچم پھڑپھڑا رہا تھا۔ جاگیرداروں کے خلاف تاجروں اور صنعتکاروں کی اس جنگ میں عوام کی شرکت سے یورپ میں جاگیردار طبقہ کا جنازہ نکل گیا اور اقتدار کا حقیقی مالک سرمایہ دار طبقہ ٹھہرایا گیا۔

ایسا اکثر ہوتا ہے اور اس کی بے شمار مثالیں ہیں کہ اقتدار کے حصول کے لئے کسی ایک طبقہ کی جانب سے کئے گئے زبانی دعوؤں کو بعد میں جوں کا توں رکھا گیا اور انہیں فوراً عملی جامہ پہنانے سے گریز کیا گیا یا یوں کہہ لیں کہ نظریاتی اعلانات کو کبھی عمل میں ڈھلنے نہیں دیا گیا۔ "مرضی کے مطابق کام کی آزادی" کا اعلان بظاہر بڑا دلفریب ہے مگر اس سحر انگیز نعرے کی ساری دلکشی اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب ایک مزدور کے لئے صرف "مسٹر ایکس" کی فیکٹری میں کام کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ رہے۔ اس کی خلاف ورزی کرنے کا مطلب سڑکوں پر فاقوں مرنا ہے۔ آزاد پریس کا نعرہ بھی کانوں کو بھلا لگنے والا نعرہ ہے مگر جب ملک کے ۹۰ فی صد اخبارات پر تین یا چار "پریس لارڈوں" کا قبضہ ہو جائے اور ایڈیٹروں اور مقالہ نگاروں کو ان کی مرضی کے خلاف لکھنے پر مجبور کر دیا جائے تو پھر یہ آزاد پریس مقبوضہ پریس بن جاتا ہے۔ ووٹ دینے کا حق بڑا قیمتی حق ہے مگر یہ حق اپنا اثر اسی وقت زائل کر دیتا ہے۔ جب سیاسی پارٹیاں چند پیشہ ور قسم کے باشندوں کے کنٹرول میں چلی جائیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عالمگیر رائے دہی کا تصور بیسویں صدی کی ترقیات کا ثمر ہے۔ ۱۹ویں صدی میں یورپ کے ترقی پذیر ممالک میں مشروط رائے دہی کا رواج تھا۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہ لیا جائے کہ میں عالمگیر رائے دہی کے خلاف ہوں یا چونکہ ووٹ دینے کا مقصد فوت ہو گیا ہے اس لئے ووٹنگ کا سلسلہ ختم کر دینا چاہیئے۔ میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے بلکہ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جمہوریت کو نظری اعتبار سے جو مقام دیا گیا عمل میں اس کو اتنا ہی پیچھے رکھا گیا۔

آج دنیا کے ایک تہائی حصے میں جاگیرداری اور بورژوا

باقی صفحہ ۹۸ پر ملاحظہ فرمائیں

عام اخبارات میں ۵۰ اور ۱۰۰ روپے ماہوار پر بیگار لی جاتی تھی

افضل صدیقی

الفتح کے ایڈیٹر صاحب نے یہ لکھ کر کہ میں اپنی یادداشتیں قلم بند کر رہا ہوں۔ مجھے مستند اور فارغ التحصیل بوڑھا ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یادداشتیں عموماً وہ لوگ لکھا کرتے ہیں جو ہر نیک و بدکام سے ریٹائر ہو چکے ہوں اور زندگی کا آخری جج بھی کر آئے ہوں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں آئندہ کئی سال تک زندگی اور زندگی کی تمام جولانیوں سے ریٹائر ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ یادداشتیں قسم کی چیز لکھنے کا انتہائی ناخوشگوار کام مجھے طوعاً وکرہاً ایڈیٹر صاحب ہی کے اصرار پر انجام دینا پڑ رہا ہے۔ میرے نزدیک اپنی ذات کے بارے میں لبقراطی بگھارنے سے زیادہ ناخوشگوار کام کوئی نہیں۔ یہ بھی ناممکن ہے کہ میں لکھوں تو اپنے تلخ تجربوں کے بارے میں لیکن ان لوگوں سے رعایت برتوں جو برسوں میرے رفیق رہے لیکن اپنے چھوٹے چھوٹے فائدوں کے لئے جنھوں نے دوستی اور رفاقت کے خوبصورت محل کو نہایت سفاکی کے ساتھ قتل کر دیا۔ یہ بھی ناممکن ہے کہ ان محسنوں کا ذکر خیر نہ ہو جو مجھ پر اعزاز و اکرام اور قدر و منزلت کے انبار لٹاتے رہے مگر پیٹ کے اتنے ہلکے اور کانوں کے اتنے کچے نکلے کہ برسوں کی محبتیں لمحوں میں بھلا بیٹھے۔ بات تو جب ہے کہ سب کچھ انتہائی بے رحمی کے ساتھ لکھا جائے۔ لیکن آدمی جب خود لکھنے بیٹھتا ہے تو اپنی ذات کے ساتھ رحمدلی ڈھیروں امنڈ پڑتی ہے کیا کیا جائے۔ یہ انسان کی اتنی فطری کمزوری ہے کہ وہ اپنے قلم اور زبان سے اپنی برائی نہیں لکھ سکتا اور جب یہ انصاف نہ ہو تو پھر لکھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس لکھنے لکھانے کے چکر میں بہت سے محسنوں اور دوستوں کی ناراضی بھی مول لینی پڑی ہے۔ اس لئے کہ دنیاداری اور مصلحت اندیشی جیسی منافقت میرے بس کی بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ؎

اِک ذراسی بات پر برسوں کے یارانے گئے
ہاں مگر اتنا ہوا کچھ لوگ پہچانے گئے

میں عام انسانوں کی طرح اپنی برائی خود بیان نہیں کر سکتا اور خاص انسانوں کی طرح اپنی خوبیاں بھی نہیں گنوا سکتا۔ جب یہ دونوں کام میں نہیں کر سکتا تو "یادداشتیں" لکھنے والا بوڑھوں جیسا کام ناخوشگوار ہوا کہ نہیں؟ بہرحال ؎

ہرچہ از دوست می رسد نیکوست!

پچھلے مضمون میں میں نے روزنامہ غالب کے بند ہونے کے سانحے کا تذکرہ کیا تھا۔ اسی روزنامہ سے صحافتی زندگی کی ابتدا کی تھی۔ مگر افسوس بسم اللہ ہی غلط ہو گئی اور اس نحوست کا سایہ آگے چل کر ہر دور میں کسی نہ کسی رنگ سے پڑتا رہا۔ سات ماہ بھی کسی روزنامے کی زندگی ہوتی ہے؟ ملک فیروز خاں نون نے بھی اخبار کو کبھی کسی وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سمجھا ہوگا کہ ادھر اخبار نکالا ادھر کونسل کی ممبری کی طرح ہن برسنے لگا۔ بہرحال جن سیاسی مقاصد کے تحت انھوں نے اخبار نکالا تھا وہ اخبار کا سہارا لئے بغیر ہی پورے ہو گئے۔ تو پھر بھلا سفید ہاتھی پالنے کی کیا ضرورت تھی۔ نواب ممدوٹ اور دولتانہ صاحب کی سیاسی چپقلشیں تو چلتی ہی رہتی تھیں۔ یہ دونوں بساط سیاست کے بڑے پھکیت شاطر تھے۔ ایک نئے مہرے کی موجودگی کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ نون صاحب انگریزوں کے پالے ہوئے پرکٹے آئی سی ایس اور خدا معلوم کیا کیا۔ بسلسلۂ کونسلری دلی میں رہتے تھے اور بہت عرصے سے پنجاب کی سیاست سے ان کا تعلق نہیں تھا۔ اب جو سیاست کے گلی کوچوں میں لوٹ کر آئے تو پنجاب کے تیور بدل چکے تھے۔ مسلم لیگ قیادت ہچکیاں لینے لگی تھی۔ اور پھر ری پبلکن پارٹی نے مسلم لیگ کی کوکھ سے جنم لیا۔ نون صاحب ادھر ہی کو لڑھک گئے۔ اور اس پارٹی میں رہتے ہوئے انہیں وزارت عظمیٰ کی نعمت غیر مترقبہ ملی۔ ان کے بعد یہ نعمت آج تک کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ ملک پارلیمانی نظام کو ترس رہا ہے۔ یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔

نون صاحب کو وہ فوائد بغیر کسی خاص جوڑ توڑ کے حاصل ہو گئے تھے۔ جو اخبار کے ذریعہ حاصل کرنے کی فکر میں تھے نالیاً اسی لئے اخبار بند کر دیا گیا۔ کارکنوں کی چار چار مہینوں کی تنخواہیں اگر دینا چاہتے تو دے سکتے تھے۔ ان کے لئے یہ کوئی بہت بڑی رقم

سالنامہ

الفتح کراچی

بخاری صاحب نے کہا "اِن کا آج ہی سے تقرر کر لیا جائے گا"

بھی نہ تھی۔ ساری بات نیت کی ہے۔ نیت ہی میں فتور آ جائے تو پھر کہاں کی دیانت اور کیسا اصول ہے اللہ انہیں کروٹ کروٹ نصیب کرے۔ خوب آدمی تھے۔

اخبار بند ہونے کے بعد تنخواہوں کے واجبات کی ادائی کا انتظار کرتے کرتے عاجز آ کر کارکن تتر بتر ہو گئے۔ جس کے جہاں سینگ سمائے وہ وہاں چلا گیا۔

مجھے کچھ ترجمہ کا کام "امروز" سے مل جایا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ عبدالرشید ارشد نے اپنے ہفت روزہ "پاکستان" سے کچھ کام دے دیا تھا۔ اس پرچے میں ہر ہفتے شذرات لکھتا تھا یا کبھی کبھار کوئی مضمون۔ معاوضہ سو روپے ماہانہ مل جاتا تھا۔ عبدالرشید ارشد اب کہاں ہیں، یہ نہیں معلوم۔ پہلے وہ نسیم حجازی والے کوہستان میں سرکولیشن منیجر تھے۔ مقبول عام پریس ان کے بھائی کا تھا۔ جہاں ہفت روزہ "پاکستان" چھپتا تھا۔ مدتوں سے ان کی خبر بھی نہیں ملی۔ میرے لیل و نہار اسی بے یقینی کی کیفیت میں گذر رہے تھے اور اس میں بظاہر کسی تبدیلی کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔ ۱۹۴۹ء سے لے کر ۱۹۷۱ء تک وقت کے بہت سے سیلاب گذر گئے ہیں۔ وقت کا ایک ایسا ہی ریلا مجھے بہا کر اکتوبر ۱۹۴۹ء میں کراچی لے آیا۔

اتفاق کی بات ہے یہاں ایک روز "اردو مجلس" کی تنقیدی نشست میں مجھے ترقی پسند تحریک پر ایک مقالہ پڑھنا تھا۔ اور اس جلسہ کی صدارت زیڈ اے بخاری صاحب کو کرنی تھی۔ جو اس وقت ریڈیو پاکستان کے باوا آدم تھے۔ اردو مجلس کی تنقیدی نشستیں ہر ~~اتوار کو پابندی سے انجمن اردو~~ اتوار کو پابندی سے انجمن ترقی اردو کی لائبریری واقع پاکستان چوک میں ہوا کرتی تھیں۔ ہوش تیموری جو میرے دلّی کے دوستوں میں سے تھے۔ اور جن کا انتقال کوئی بارہ سال پہلے لندن میں ہوا۔ اس مجلس کے روح و رواں تھے وہی مجھے اس روز اپنی مجلس میں لے گئے تھے۔ بخاری صاحب کی زیر صدارت کوئی تیس بتیس افراد کے اجتماع میں میں نے اپنا مقالہ پڑھا۔ بحث ہوئی اور فرید جاوید کی غزل کے بعد محفل ختم ہو گئی۔ چائے کا دور شروع ہوا۔ اور گفتگو بھی۔ بخاری صاحب نے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی وہ مقالہ پسند کیا تھا۔ گفتگو کے دوران انہوں نے پوچھا کہ میں کیا کرتا ہوں۔ اور جب انہیں یہ پتہ چلا کہ میں بیکار ہوں اور چند گھریلو کاموں کے سلسلہ میں عارضی طور پر کراچی آیا ہوں تو انہوں نے مجھ سے پوچھا "ریڈیو میں کام کرو گے؟" میں نے جواب دیا "میں تیار ہوں۔ لیکن لاہور ریڈیو اسٹیشن میرے لئے مناسب رہے گا۔ کیونکہ میرا گھر بار وہیں ہے۔" بخاری صاحب نے کہا "تم تو لاہور ریڈیو اسٹیشن کے لئے موزوں رہو گے مگر لاہور کا ریڈیو اسٹیشن تمہارے لئے موزوں نہیں رہے گا۔ بہتر ہے کہ تم کراچی اسٹیشن پر کام کرو۔ اور کل صبح دفتر آ کر مجھ سے ملو۔"

مجھے ملازمت درکار تھی۔ کسی اخبار میں اس وقت کل وقتی کام نہیں نکل رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ کراچی ریڈیو اسٹیشن پر فی الحال کام شروع کر دیا جائے۔ دو چار ماہ کے بعد لاہور تبادلے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ اس موقع کو کیوں گنوایا جائے۔ چنانچہ میں دوسرے روز نشاط سینما کے سامنے ریڈیو پاکستان کے ہیڈ کوارٹر میں بخاری صاحب سے جا کر ملا۔ وہ

اخبار کی ملازمت

مالکِ اخبار

کے اشارہ پر جمتی

اور اکھڑتی تھی

تپاک سے ملے۔ شعر و ادب پر تھوڑی دیر وہ مجھ سے گفتگو کرتے رہے۔ پھر انہوں نے ن م راشد اور حفیظ ہوشیارپوری کو بھی اپنے کمرے میں بلا لیا۔ اس زمانے میں یہ دونوں بزرگ ریڈیو پاکستان کے ہیڈ کوارٹر ہی میں کام کرتے تھے۔ کسی اسٹیشن پر تعینات نہیں کئے گئے تھے۔

راشد صاحب اور حفیظ صاحب کے آنے کے بعد چائے آئی۔ شعر سنے اور سنائے گئے۔ بخاری صاحب نے ان دونوں سے میرا تعارف کچھ ایسے الفاظ میں کرایا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ حضرت مجھے محض بیوقوف بنا رہے ہیں۔ اور ان کے چلے جانے کے بعد مجھے چلتا کریں گے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہم چاروں کی گفتگو میں ایک پروگرام کا خاکہ تیار ہوا۔ اس کا نام "تازہ بتازہ" طے پایا۔ مجھے یہ دس منٹ کا پروگرام روزانہ لکھنا ہو گا۔ اور بالکل سچ سچ۔ کراچی کا کوئی واقعہ، کوئی حادثہ، شہر کی کوئی دلچسپ شخصیت، کوئی تفریحی مقام اس کی جھلکیاں اور ساتھ ہی سننے والوں کے لئے کوئی درس عبرت بھی۔ شہر میں لاتعداد ایسے واقعات ہوتے ہیں جنہیں ہر روز پروگرام کا موضوع بنایا جا سکتا ہے۔ بخاری صاحب نے یہ سب کچھ طے کرنے کے بعد اس وقت کراچی کے اسٹیشن ڈائرکٹر مطلب صاحب کو جو اب ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل کے عہدہ سے ریٹائر ہو چکے ہیں میرے سامنے فون کیا کہ ایک صاحب کو بھیج رہا ہوں ان کا آج ہی تقرر کر لیا جائے۔ تفصیل بعد میں بتاؤں گا۔"

اور پھر میں اسی روز کراچی اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ اس زمانے میں ریڈیو اسٹیشن انٹیلی جنس اسکول کوئنز روڈ پر چند خیموں اور کھپریل کی چھتوں والے دو اسٹوڈیوز پر مشتمل ہوتا تھا۔ پھر ۱۹۵۱ء میں ریڈیو اسٹیشن بندر روڈ پر (موجودہ جگہ) منتقل ہو گیا۔ نئے اسٹوڈیوز کا افتتاح ملک کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خاں نے کیا تھا۔ انہوں نے افتتاحی تقریر براڈکاسٹنگ ہاؤس کے اسٹوڈیو نمبر ۵ سے نشر کی تھی۔ جہاں سے آجکل میں اسی کرسی پر بیٹھ کر اسی میز کے سامنے اخباروں کے اداریے براڈکاسٹ کرتا ہوں۔

ریڈیو میں دسمبر ۱۹۴۹ء میں میرا تقرر ہوا تھا اور اگست ۱۹۵۷ء میں ریڈیو سے الگ ہوا۔ ۷½ سال کا یہ عرصہ عجیب خود فراموشی کے عالم میں گزرا۔ بے شمار پروگرام لکھے اور براڈکاسٹ کئے۔ بہت ساری داستانوں نے یہاں جنم لیا۔ بے شمار واقعات آنکھوں سے دیکھے اور لاتعداد تجربات سے گزرا۔ یہ ایک الگ اور طویل داستان ہے۔ ساڑھے سات

اس وقت "امروز" کے سوا کسی اخبار میں تنخواہوں کا سکیل نہیں تھا

برسوں کی یہ داستان الگ ایک ضخیم کتاب کی متقاضی ہے۔ لیکن چونکہ ریڈیو کے تجربات و مشاہدات میری صحافتی زندگی سے تعلق نہیں رکھتے اسلئے میں انہیں نہیں چھیڑوں گا۔ میں بہر حال بخاری صاحب کا احسان نہیں بھول سکتا جن سے میں نے لکھنے کے ڈھنگ بھی سیکھے اور براڈ کاسٹنگ کے ہنر بھی۔ یہ تجربے آج بھی میرے کام آرہے ہیں۔

گویا صحافتی دور میں ساڑھے پانچ برس کا سکتہ آیا۔ اور ۱۹۵۷ء کے بعد سے پھر صحافت اپنا مقدر بنی۔ اس زمانے میں لاہور کا امروز کراچی سے بھی زور شور کے ساتھ نکل رہا تھا۔ جنگ اور انجام سے تو زیادہ اس کی اشاعت نہیں تھی۔ لیکن محنت کش طبقے اور پڑھے لکھے سنجیدہ طبقے میں اسے بہت پڑھا جاتا تھا۔ ریڈیو سے نکلا تو امروز میں کام کرنے کی تمنا پھر بیدار ہوگئی۔ اس زمانے میں چراغ حسن حسرت صاحب امروز چھوڑ چکے تھے۔ اور فیض صاحب پاکستان ٹائمز اور امروز کے ایڈیٹر تھے کراچی کے امروز کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر قاضی ابرار حسن صدیقی تھے۔ جو آجکل انگریزی روزنامے "بزنس ریکارڈر" میں اسسٹنٹ ایڈیٹر ہیں۔ ان سے میری یاد اللہ ریڈیو میں ملازمت کے دوران ہی ہوگئی تھی۔ میں ان سے جاکر ملا اور امروز میں ملازمت کی خواہش ظاہر کی اپنے حالات بتائے اور یہ بھی بتایا کہ اب لاہور دوبارہ منتقل ہونے کو میرا دل نہیں چاہتا۔ اس لئے اخبار ہی میں میرے لئے کوئی صورت نکالئے۔

یہ میں بتاتا چلوں کہ ریڈیو میں جب میں بھرتی ہوا تھا تو میری تنخواہ ۱۷۵ روپے تھی یعنی ۱۹۴۹ء میں اور جب ۱۹۵۷ء میں ریڈیو چھوڑا تو تنخواہ پونے چار سو روپے تک پہنچ گئی تھی۔ ۱۹۴۹ء کے پونے دو سو روپے کی رقم آج ۱۹۷۱ء میں بہت کم معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس زمانے میں یہ تنخواہ بہت کافی تھی۔ پاکستان میں ۱۹۵۷ء میں جتنے اخبار نکل رہے تھے ان میں سوائے امروز کے کسی اخبار میں کارکنوں کی تنخواہ کا کوئی اسکیل مقرر نہیں تھا۔ عامل صحافی بہت خستہ حالی میں زندگی بسر کر رہے تھے اور مالکان اخبارات بڑے بڑے طرم خانوں کی عزت کھڑے کھڑے دو کوڑی کی کر دیا کرتے تھے۔ میں نے گریجویٹ اور ایم اے پاس نوجوانوں کو ڈیڑھ سو دو سو روپیہ ماہوار پر اخباروں میں اپنی زندگی خراب کرتے دیکھا ہے۔

یہی وہ دور تھا جب صحافت سے اس کا مقصد اور مشن دور ہوتا جا رہا تھا اور اخبار باقاعدہ صنعت بنتے جا رہے تھے۔ اس استحصالی دور میں بھی امروز میں کام شروع کرنے والے سب ایڈیٹر کی ابتدائی بنیادی تنخواہ دو سو بارہ روپے ہوتی تھی۔ اس سے کم تنخواہ کا رواج نہیں تھا جبکہ دوسرے اخباروں میں پچاس روپے اور سو روپے ماہانہ پر لوگ پارٹ ٹائم کام کر رہے تھے۔ سو یا پچاس روپے پر تین چار گھنٹے خبروں کا ترجمہ کرنے والے مجبوروں کا ان اخباروں میں خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ انہیں مترجم کہا جاتا تھا۔ سب ایڈیٹر کہلانے کی سعادت انہیں حاصل نہیں ہوتی تھی۔ اور نہ حفظِ مراتب اور منصب داری کا

عامل صحافی بہت
خستہ حالی میں
زندگی گذار
رہے تھے

کا چلن تھا۔ ہر کسی کی ملازمت مالک اخبار کے اشارہ پر چلتی اور اکھڑتی تھی۔ کسی سے کوئی غلطی ہوگئی تو اس کا کھڑے کھڑے حساب چکتا کر دیا گیا۔ اور اس کی جگہ دوسرے ہی روز پھر کوئی سو روپے پر چار گھنٹے کام کرنے والا پکڑ لیا گیا۔ یہ رواج امروز ہی میں تھا کہ وہاں تنخواہوں کے اسکیل بھی مقرر تھے اور عہدے بھی۔ مترجم کسی کو نہیں کہا جاتا تھا۔ بلکہ سب ایڈیٹر گردانا جاتا تھا۔ میں پونے چار سو کی ملازمت چھوڑ کر آیا تھا تو امروز میں ۲۱۲ روپے کا ابتدائی اسکیل کیسے قبول کر لیتا۔ مگر مجبوری تھی۔ میں اپنے شوق کی خاطر گردشِ ایام کو پیچھے لوٹانے پر تیار تھا۔ اس وقت امروز میں کوئی جگہ خالی نہیں تھی۔ کسی نئے آدمی کے لئے جگہ پیدا کرنا اور اس کا جواز ثابت کرنا یہ قاضی ابرار صاحب کے لئے مشکل تھا۔ کیونکہ ہر ملازم کے تقرر کی قطعی منظوری لاہور کے ہیڈ آفس ہی سے آتی تھی۔ قاضی صاحب بھی اپنی جگہ مجبور تھے۔ لیکن انھوں نے مجھے ٹکا سا جواب نہیں دیا۔ بلکہ کچھ ایسا کام کر دیا کہ کوئی سب ایڈیٹر اگر چھٹی پر چلا جائے تو میں اتنے دن تک اس کی جگہ کام کروں۔ ۲۱۲ روپے کے حساب سے مجھے معاوضہ مل جایا کرے گا۔ ان دنوں ایک صاحب چھٹی پر گئے ہوئے تھے میں اس روز سے ان کی جگہ کام شروع کر دیا۔ وہ صاحب واپس آئے تو ایک اور صاحب نے چھٹی کی درخواست دیدی۔ اور میں پھر ان کے بدلے کام کرنے لگا۔ اسی طرح یہ چکر تین ماہ تک چلا اور مجھے ہر ماہ پوری تنخواہ ملی۔ اس تنخواہ میں چونکہ گزارہ محال تھا اس لئے قاضی ابرار صاحب نے مجھے پہلے ہی دن برطانوی خبر رساں ادارے "اسٹار نیوز ایجنسی" میں ایڈیٹر انچارج عثمان صدیقی کے پاس بھیج دیا۔ وہاں اکثر کام نکلتا تھا۔ اسٹار نیوز ایجنسی میں انگریزی خبروں کا ترجمہ اُردو میں براہ راست اسٹینسل پر ہوتا تھا۔ لوہے کے قلم سے اسٹینسل کاٹے جاتے تھے۔ یہ مجھے خاصی ٹیڑھی کھیر معلوم ہوئی۔ عثمان صدیقی کے کہنے پر ٹیسٹ تو میں نے دے دیا۔ مگر میں خود مطمئن نہیں تھا۔ بہر حال چونکہ انہیں ایک آدمی کی ضرورت تھی اس لئے دوسرے ہی دن مجھے مترجم یا "اسٹینسل کٹر ایڈیٹر" کی حیثیت سے اسٹار نیوز ایجنسی میں ملازم رکھ لیا گیا۔ قاضی ابرار صاحب کے عثمان صدیقی کے ساتھ یارانے کا بھی میرے تقرر میں دخل تھا۔ چنانچہ اب صورتحال یہ بنی کہ میں اسٹار نیوز ایجنسی میں بھی فل ٹائم کام کرتا تھا اور امروز میں بھی۔ "اسٹار" میں صبح دس بجے سے چار بجے تک کام کرتا اور شام کو چھ بجے امروز آجاتا تو رات کو ایک بجے گھر جانا نصیب ہوتا۔ اسٹار میں تنخواہ دو سو روپے طے پائی۔ امروز میں ۲۱۲ ملتے ہی تھے۔ اس طرح چار سو ۱۲ روپے کی آمدنی ہونے لگی۔ جو بہر حال ریڈیو کی تنخواہ سے زیادہ تھی۔

علاقے کے سارے نمبری بدمعاش اور ہسٹری شیٹر اُسکی چلم بھرتے تھے

کی مٹی کو تتر مسار کر دیا ہے۔ حرامی عورتوں کا کاروبار بھی کرتا ہے۔ جانے اس فرعون کو مارنے کے لئے کب کوئی موسیٰ آئے گا۔"

"یار اس کے منہ کون لگے۔ جینا حرام کر دیگا۔"

پورے علاقے میں بس ایک عورت تھی جو جھما جھم اپنے چوکھٹ سے نکلتی اور بجلی کے کوندے کی طرح صدیق پہلوان کی دکان کے سامنے سے لپکتی جھپکتی بس میں بیٹھ جاتی۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن لالوکھیت اپنے چچا کے گھر جاتی۔ اور پہاڑیوں کا رنگ میلا ہونے سے پہلے پہلے اپنے گھر آجاتی۔ وہ کریم حلوائی کی جوان لڑکی نصیبن تھی گندمی رنگ، بھرے بھرے ہونٹ، تربوز کی پھانک کی طرح لانبی لانبی آنکھیں اور ان میں کاجل کی دو دھاری تلوار، ناک کی پھننگی پر چھوٹا سا سیاہ مسّا، سیاہ برقعہ میں اس کا جسم کبوتر کی طرح غٹرغوں، غٹرغوں بولتا۔ اپنا سر اونچا کئے جب دکان کے سامنے سے گزرتی تو پہلوان کا دل ایکدم سے اُچھل کر حلق میں آجاتا۔ اس کا سارا جسم پسینے میں ڈوب جاتا۔ وہ پوری طاقت سے تانبے کے برتن میں لسی پھینٹنے لگتا۔

"استاد قیامت ہے قیامت"

"پہلوان اس تنے ہوئے کمان پر بس تیر چڑھانے کی کسر ہے۔ کیا خیال ہے؟"

"اوں۔ کیا کہا۔" صدیق پہلوان خواب سے چونک اٹھتا۔ اور اس کے چیلے چانٹے استاد کی اس غیر حالت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے زور زور سے ٹھٹھہ لگانے لگتے۔

"چُپ بے تیری ——" پہلوان کی ایک ہی گھُرکی سے زبان پر تالے لگ جاتے — صدیق پہلوان کسی کام سے اندر کمرے میں چلا جاتا تو اس کے چیلوں کی سرگوشیاں تیز ہو جاتیں۔

"یار استاد کا بُرا حال ہے۔ کچھ کرو۔"

"ہاں یار استاد کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

"بُلبُل کو دیکھ کر استاد کا رنگ اُڑ جاتا ہے۔"

"کسی دن اُسے گھر سے اُٹھا لیں، استاد کو یہ تحفہ پسند آئے گا۔ کیا خیال ہے؟"

"ٹھیک ہے، کسی دن پروگرام بنالو۔"

"کیا باتیں شاتیں ہو رہی ہیں؟" استاد کمرے سے باہر نکلتے ہوئے سوال کرتا۔

"کچھ نہیں استاد، فلم کا پروگرام بن رہا ہے۔ ناز پر بڑی قاتل فلم لگی ہے۔ نیفو چلنے کو کہہ رہا ہے۔"

نصیبن کو اس کے باپ نے کئی بار منع کیا، مگر وہ باز نہ آئی۔ پڑوس والوں نے شکایت کی۔ "کریم، اس عمر میں کیوں اپنے منہ پر کالکھ لگوانا چاہتا ہے۔ اپنی منہ زور بیٹی کو لگام دے کہیں ایسا نہ ہو کہ آخری دن پچھتاوے میں گذرے۔" کریم حلوائی نے ایک دن ہاتھ جوڑ کر اپنی بیٹی سے کہا "نصیبن میرے بازو میں اتنی سکت نہیں جو تیری حفاظت کر سکے۔ سینے میں اتنا زور نہیں کہ اگر تجھے کچھ ہو گیا تو چیخ سکوں کہ دھرتی اور آسمان ہلنے لگے۔ تیری ماں زندہ ہوتی تو تجھے اپنی زبان میں سمجھاتی۔

گندمی رنگ

رسیلے ہونٹ

تربوز کی پھانک

جیسی آنکھیں

میں تیرا باپ ہوں۔ مرد ہوں، اس زبان میں بات نہیں کر سکتا۔ للہ اُدھر سے جانا چھوڑ دے۔ اگر تجھے کچھ ہو گیا تو سنکھیا کھا لوں گا۔ ندی نالے میں ڈوب مروں گا۔"

نصیبن کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا باپ کیا کہہ رہا ہے۔ اس نے بڑے بھولپن سے کہا "تم کیوں سنکھیا کھاؤ گے۔ سنکھیا کھائے تمہارے دشمن۔ آخر اُدھر سے کیوں نہ جاؤں۔ میں کسی کا کھاتی ہوں جو راہ چھوڑ کر چلوں۔"

کریم اس روز اپنی بیٹی سے باتیں کر کے باہر نکلا تو پڑوس کی عورتوں سے بولا "بہنو تم ہی اس سر پھری لڑکی کو کچھ سمجھاؤ۔ میری بات پر تو کان نہیں دھرتی۔"

صدیق پہلوان، آنگن کے فرش پر سو رہا تھا اندر کمرے میں اسے نیند نہ آئی۔ سخت گھٹن اور گرمی تھی۔ مچھر الگ بھنبھنا رہے تھے۔ وہ جھنجھلا کر اُٹھا اور آنگن میں دری بچھا کر سو گیا۔ اس کے سرہانے لمبے پھل والا چاقو رکھا تھا۔ صدیق پہلوان اکثر اپنے ملنے والوں سے کہتا "میری آدھی جان اس چاقو میں ہے۔"

ابھی نصف گھنٹہ بھی نہ گزرا ہوگا کہ دروازے پر ہلکی ہلکی دستک ہوئی۔ صدیق پہلوان کچی نیند سوتا — اُدھر کھٹ کھٹ کی آواز ہوئی۔ اُدھر پھٹ سے اسکی آنکھ کھل گئی۔ وہ بڑبڑاتا ہوا اُٹھ بیٹھا "سالے رات کو بھی خلل ڈالتے ہیں۔" دروازہ کھول کر اس نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ سامنے رات کی گہری سیاہی میں نیفو، ننّے اور دلدار بھتنوں کی طرح کھڑے تھے۔

"کیا ہے بے۔ اتنی رات کو کیا ضرورت پڑ گئی؟" استاد نے تلخ لہجے میں کہا۔

"نیفو آگے بڑھ کر پھسپھسایا۔" استاد واڑتے پر چلو، تمہارے واسطے ایک تحفہ لائے ہیں۔"

"تحفہ، اور اتنی رات کو، ابے تم لوگوں نے کیا کھیل رچایا ہے۔" صدیق پہلوان کے لہجے میں پہلی جیسی کڑواہٹ اب بھی موجود تھی۔

"بس استاد ڈیرے پر چل کر دیکھو، اگر تحفہ پسند نہ آئے تو میرے حلق پر چھُری پھیر دینا۔"

تحفہ دیکھ کر صدیق پہلوان کی آنکھیں پھندا لگے مرغے کی طرح باہر اُبل آئیں۔ پیروں میں سنسناتا ہوا خون دماغ میں پہنچ کر تیزی سے گردش کرنے لگا۔ اس کا سارا جسم غصّہ اور نفرت سے کانپ رہا تھا۔ چارپائی پر نصیبن بے ہوش پڑی تھی۔ کھلے ہوئے بال، نیم وا ہونٹ، آنکھوں پر سیاہ پلکوں کا گہرا سایہ۔ اس کی کمر کا نچلا حصّہ کھلا تھا۔ — صاف و شفاف آئینہ کی طرح —

صدیق پہلوان کی آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔ استاد کی یہ کیفیت دیکھ کر، ننّے نے کہا "استاد تحفہ پسند نہیں آیا۔ ابھی اُٹھا کر لاتے ہیں۔"

"سوّر کے جنو یہ کیا کیا تم لوگوں نے ـــ کیا قیامت ڈھادی تم نے"

"کیا ہوا استاد، کیا یہ تمہیں پسند نہ تھی"

"اسے دیکھ کر تو تمہارے حلق میں پھانسیں لگنے لگتی تھیں"

لعنت ہے تم پر، اور تمہارے حوصلے پر، ایک کمزور عورت کو گھر سے اٹھالائے، عورت اس دنیا کی سب سے کمزور مخلوق ہے۔ تم سب جانتے ہو کہ میں نے زندگی میں کبھی کسی عورت پر ہاتھ نہیں رکھا ـــ چلو جلدی کرو ـــ اسے جہاں سے اُٹھا کر لائے ہو، وہیں خاموشی سے رکھ آؤ۔ یہ میرے مان کے خلاف ہے کہ رات کی تاریکی میں اس عورت سے منہ کالا کروں"

"نہیں استاد، اب یہ لڑکی اس ڈیرے سے ایسے واپس نہ جائے گی" بیفو نے نصیبن کو کو للچائی ہوئی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا "اگر یہ تمہیں پسند نہیں آئی تو کیا ہوا، ہم مر گئے ہیں ـــ" نتّے نشہ کی جھونک میں بہک گیا۔ "کیا کہا" صدیق پہلوان نے حلق پھاڑ کر کہا "ہماری بلّی ہمیں سے میاؤں، آنتیں نکال دوں گا"

"بس کرو استاد، یہ آنتیں وانتیں نکالنے کی دھمکی کسی اور کو دینا۔ خاموشی سے جاکر سو جاؤ" دلدار نے پہلوان کو دھکا دیتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ ایسے نہ مانو گے" صدیق پہلوان لمبے پھل کا چاقو کھول کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے اس کے تینوں شاگرد بے حیائی سے کھڑے تھے "استاد اب بھی وقت ہے، تم یہاں سے چلے جاؤ۔ ہم اسے تھوڑی دیر کے بعد آرام سے گھر پہنچا دیں گے۔ کانوں کان خبر نہ ہوگی"

"نہیں، اسے ابھی پہنچاؤ" صدیق پہلوان کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔

"اچھا تو تم نہیں مانو گے۔ ویسے استاد افسوس رہے گا" کمرے کی گھٹی گھٹی نیم روشن فضا میں تین اور چاقو کُھل گئے۔ پھر تینوں بھُوکے گدھ کی طرح استاد پر ٹوٹ پڑے۔ لالٹین کی ہلکی روشنی میں چاقو لہراتے تو لمحہ بھر کے لئے کمرے میں بجلی کوند جاتی۔ نصیبن کی آنکھ کھُل گئی تھی۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ پھر جب اس نے دماغ پر زور دے کر اندر کے حالات سمجھنے کی کوشش کی تو سہم کر ایک کونے میں سمٹ گئی۔ اس کے کانوں میں باپ کی آواز گونج رہی تھی۔ "بیٹی اگر تجھے کچھ ہو گیا تو میں سنکھیا کھا لوں گا"

آج وہ اپنے بابا کی ساری باتیں سمجھ گئی تھی۔

صبح سویرے محلے میں قیامت کا شور تھا۔ پورے علاقے میں جگہ جگہ پولیس کھڑی تھی۔ ایک دم سے چار آدمیوں کے قتل کی واردات معمولی واقعہ نہ تھا۔ ڈیرے میں صدیق پہلوان کے تینوں چیلوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ ان کے جسموں پر چاقو کے بےشمار گہرے گھاؤ تھے اور ان کی آنتیں اُبل پڑی تھیں۔ صدیق پہلوان بھی مردہ حالت میں خیراتی حلوائی کے گھر کے کچھ فاصلے پر پڑا تھا۔ اس کے جسم پر بھی چاقو کے نشانات تھے۔ زمین پر ڈھیر سارا خون جما تھا۔ اس کا چاقو اس کی لاش سے تھوڑی دُور خون میں لت پت پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں کھُلی تھیں جس میں اب بھی نفرت کا سرخ الاؤ دہک رہا تھا۔ کسی نے اس کی لاش دیکھ کر کہا "خس کم جہاں پاک" چھٹے ہوئے بدمعاش سے محلے کے شریفوں کو نجات مل گئی"

بقیہ: تختی

دھوئیں کی حکومت تھی.

جب وہ قریب پہنچا تو لوگوں نے اسے روک لیا وہ سائیکل پھینک کر، اپنے آپ کو چھڑا کر آگ کی طرف لپکا لیکن ایک ساتھ کئی ہاتھ بڑھے اور اسے جکڑ لیا

حامد علی پوری قوت سے چلاّیا.

"مجھے جانے دو ـــ وہاں میرے بیوی بچے ہیں۔

لیکن کسی نے اس کی نہ سنی اور اسے دھکیلتے ہوئے دوسری طرف لے چلے۔ وہ ساتھ ساتھ اسے سمجھاتے جا رہے تھے۔

"وہاں کچھ نہیں بچا ـــ سب جل گیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ مکینوں کو نکالنے کا وقت مل گیا تھا"

پھر ایک شخص نے مسجد کے سامنے والے بڑے میدان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"جاؤ ـ اپنے بیوی بچوں کو وہاں تلاش کرو"

حامد علی کی جان میں جان آئی وہ دوڑتا ہوا مسجد کے سامنے والے بڑے میدان میں پھیلے ہوئے عورتوں اور بچوں کے ہجوم میں پہنچا اور اپنے بیوی بچوں کو تلاش کرنے لگا۔

اچانک اس کی نظر رضا علی پر پڑی وہ ایک چارپائی کے سلگتے ہوئے پائے سے کھیل رہا تھا ـــ پھر دھوئیں کی دبیز تہوں میں سے اس کی بیوی کا چہرہ جھانکنے لگا وہ دیوار کا سہارا لئے نڈھال لیٹی تھی۔ عائشہ اس کی گود میں پڑی رو رہی تھی ـــ ضیاء علی ماں کے گھٹنے سے لگا بیٹھا تھا.

حامد علی ہانپتا ہوا ان کے پاس آیا۔ اسے دیکھ کر زینب کمزور آواز میں ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

"جو کچھ تھا ـــ وہ بھی جل گیا ـــ اب کیا ہوگا۔؟"

حامد علی نے پلٹ کر انسانی کوششوں کے ملبے کی طرف دیکھا۔ اس کے ذہن میں بجلی سی کوندی۔ اس نے بڑھ کر زینب کا بازو تھام لیا

"وہ تختی کہاں ہے"

زینب کی قوت گویائی جواب دے گئی.

حامد علی نے اس کے بازو پر اپنی گرفت اتنی سخت کر دی کہ وہ بلبلا اٹھی. زینب کو اس کی آنکھوں میں ابلتا ہوا طوفان یاد آگیا ـــ وہ طوفان جو تختی کو ایک بار بازار میں پھینک دینے پر اس پر ٹوٹ پڑا تھا ـــ اس سے بولا نہ جا رہا تھا.

حامد علی نے اس کا دوسرا بازو پکڑ کر اُسے جھنجھوڑ ڈالا

"تختی کہاں ہے ؟"

زینب نے ایک ہچکی لی

"وہ بھی جل گئی" پھر خوف سے اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنی کھال کے چٹخنے کا انتظار کرنے لگی ـ لیکن کچھ بھی نہ ہوا. اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں حامد علی کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی.

زینب کا خوف دور ہوا تو اسے پھر سے گھر کے سامان کی یاد آئی. وہ پھر چیخ چیخ کر اپنے نقصان کا اعلان کرنے لگی

حامد علی نے ایک بار پھر اس کے دونوں بازو تھام لئے ـ لیکن اب اس کے ہاتھوں میں نرمی تھی ـــ وہ بولنے لگا جیسے خود اپنے آپ سے پوچھ رہا ہو.

"تختی جل گئی ـــ سچ مچ جل گئی"

اور پھر زینب کے جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے عائشہ کو گود میں لے لیا اور پہلی بار بھینچ بھینچ کر پیار کیا ـــ پھر وہ زینب کی طرف پلٹا۔

"چھوڑ اب یہ رونا دھونا ـــ اچھا ہوا سب جل گیا فکر نہ کر ـــ اب سب ٹھیک ہو جائے گا ـــ سب ٹھیک ہو جائے گا"

عوامی رہنماؤں کی گرفتاریاں

انھوں نے
پابندِ سلاسل ھوکر
عوامی تحریک کو
آگے بڑھایا

مئی ۱۹۷۰ء سے

مئی ۱۹۷۱ء تک

بیشتر عوامی رہنما نوکر شاہی کا شکار ہوئے

وقائع نویس

فیلڈ مارشل ایوب خان کے زوال کے بعد عوامی اُبھار نے نیا رُخ اختیار کیا۔ ایوب خاں کے خلاف عظیم عوامی اُبھار نے معاشی بدحالی، اقربا پروری اور نوکر شاہی کی من مانی کارروائیوں کی وجہ سے جنم لیا تھا۔ مٹھی بھر ملک دشمن ایک طرف تھے اور بارہ کروڑ عوام دوسری طرف صف آرا نظر آتے تھے۔ ایک ایسا ڈکٹیٹر جسے نوکر شاہی کے ذریعے سیاہ و سفید کا اختیار مل چکا تھا۔ جس کا سکہ چلتا تھا۔ جس کے خلاف آواز اٹھانے والا کوئی نہ تھا۔ نام نہاد سیاست دان موت کے خوف سے اپنے اپنے محلات میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے تھے ان حالات میں کراچی سے نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے ہفتہ مطالبات منانے کا اعلان کیا۔ ان کے تمام رہنما جیلوں میں بند کر دیئے گئے۔ خیبر سے ذوالفقار علی بھٹو نے صدا دی تو مغربی پاکستان کے عوام گھروں سے باہر نکل آئے۔ بھٹو جیل میں چلے گئے۔ عوام کو نجات کا راستہ مل گیا تھا۔ نہتے عوام نے خیبر سے چاٹگام تک اپنا فرض ادا کیا۔ دھرتی خون کی پیاسی تھی۔ انہوں نے اس سے دریغ نہ کیا۔ یہ وہ دور تھا جب خون دینے کی رسم کو پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار نمایاں مقام ملا۔ ایوب خان چلے گئے اور ملک میں جنرل آغا محمد یحییٰ خان کی سربراہی میں عبوری حکومت قائم ہوگئی

پہلی بار عوام کو اپنی طاقت کا ثبوت ملا۔ وہ محسوس کرنے لگے کہ اقتدار کے اصل مالک وہی ہیں۔

ایوب خان کے چلے جانے کے بعد روٹی، کپڑے اور مکان کے مسائل جوں کے توں رہے۔ صدر یحییٰ واضح طور پر اعلان کر چکے تھے کہ "میں انتخابات کراؤں گا۔ اقتدار عوامی نمائندوں کے سپرد کر دوں گا۔ فوج بیرکوں میں واپس چلی جائے گی۔" اس اعلان نے عوام میں مزید اعتماد پیدا کیا۔ نوکر شاہی کے ۳۰۳ عہدوں کی برطرفی نے اور تقویت پہنچائی۔ چند ماہ بعد حالات نے پھر رُخ بدلا۔ عوام نے محسوس کیا کہ نوکر شاہی، جاگیردار، سرمایہ دار کا گٹھ جوڑ ہو رہا ہے۔ متروک سیاست دان چور دروازوں سے اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں عبوری حکومت کے بعض وزراء کی کھلّم کھلا حمایت حاصل ہے۔ یہ حقیقت تھی۔ اس کے نتیجہ میں طلبہ، مزدوروں اور کسانوں کو آزمائش کا سامنا کرنا پڑا۔ صدر مملکت اپنے منصوبے کے مطابق اقتدار کی منتقلی کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف تھے اور دوسری طرف یہ ہو رہا تھا۔

معراج محمد خان گرفتار کر لئے گئے۔ انہوں نے گودھرا کیمپ کے باسیوں کی بیدخلیوں کے خلاف تقریر کر دی تھی۔ انہیں اس قابلِ اعتراض تقریر کے جُرم کی پاداش میں جیل بھیج دیا گیا۔ رہا ہوئے تو راولپنڈی میں پکڑے گئے۔ عدالت نے انہیں چھ سال قید با مشقت کا حکم سنایا۔ میر علی احمد تالپور اور طارق عزیز نے ایام اسیری حیدر آباد میں کاٹے۔ مختار رانا اور مولانا کوثر نیازی نے جیل کی چار دیواری میں بیٹھ کر الیکشن جیتا۔ مختار رانا کے لئے تو جیلوں نے اپنے دروازے ہر وقت کھلے رکھے۔

شمالی ہشت نگر کے کسانوں پر فائرنگ اور گرفتاریاں بھی اسی سن کے حصے میں آتی ہیں۔ افضل بنگش ابھی تک بند ہیں۔ ٹھٹھہ کے مزدوروں اور کسانوں کی تحریک ۱۹۷۱ء نے رقم کی ہے۔ گرفتاریوں کی تفصیل یہ ہے۔

ادیب اور صحافی: فارغ بخاری۔ عبداللہ ملک انور علیمی اور عاشق جعفری۔ مزدور رہنما، عثمان بلوچ۔ خان اشفاق احمد خاں، اشرف رضوی، محمود نواز بابر، شمیم واسطی، پروفیسر مبارک حیدر، راحت ملک، مسٹر ریاض احمد، عزیز الحسن، شیخ محمود، شاہ جہاں خان، محمد اقبال، یاسین خان، فیض اللہ خاں، سراج، نثار، سلیم، نوشیرواں، نیازی اور دوسرے سینکڑوں۔ ان میں سے عثمان بلوچ پچھلے دنوں تک کراچی جیل میں تھے۔ اب انہیں کہیں اور منتقل کر دیا گیا ہے۔ ریاض احمد طویل ترین سزا کے مستحق قرار پائے۔ انہیں داؤد کاٹن ملز کی ہڑتال کے دوران گرفتار کیا گیا تھا۔

طلبہ: سب سے زیادہ سزا نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے رہنماؤں کو ملیں۔ این ایس ایف کے صدر جناب رشید حسن خاں سزا کاٹنے کے بعد ۲۲ر جولائی ۱۹۷۱ء کو رہا ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ این ایس ایف سندھ کے صدر جناب زاہد حسین، پنجاب کے صدر پرویز رشید، خواجہ شریف، سمیع عمر، راجہ انور، جہانگیر بدر اور عبدالخالق (پاکستان کا سب سے کم عمر قیدی) گرفتار ہوئے، اور سزا وار ٹھہرے۔

یہ نام وہ تھے جن کا علم ہمیں تھا۔ سینکڑوں ایسے بھی ہوں گے جن کا علم نہیں۔ ان ناموں کا اندراج محض ۱۹۷۰ء ۱۹۷۱ء کی گرفتاری اور سزاؤں کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرنا ہے۔

زرعی ترقیاتی بینک پاکستان
بہتر زراعت کے ذریعہ قومی خوشحالی کا ضامن

زرعی ترقیاتی بینک پاکستان نے زرعی آلات اور جدید اصولوں سے استفادہ کی رفتار کو تیز تر کر کے ملک میں کاشتکاری کو فروغ دینے اور پیداوار بڑھانے میں نمایاں حصّہ لیا ہے۔

زرعی ترقیاتی بینک ٹریکٹر، پاور ٹلر، پاور پمپ، ٹیوب ویل اور دوسرے زرعی آلات خریدنے کے لئے آسان قسطوں پر قرضے دیتا ہے۔ وہ ماہی گیری اور چاء کی صنعت کی ترقی کے لئے قرضوں کی سہولتیں مہیا کرنے کے علاوہ بہتر بیج، کھاد اور کیڑے مار دواؤں کے لئے بھی سرمایہ فراہم کرتا ہے۔

بینک کاری کی تمام سہولتوں کے علاوہ جن میں کرنٹ اور سیونگ بینک اکاؤنٹ بھی شامل ہیں زرعی ترقیاتی بینک آپکی معیادی امانتوں پر دوسرے منظور شدہ بینکوں کے مقابلہ میں ایک فیصد زیادہ منافع دیتا ہے۔

مشرقی اور مغربی پاکستان میں ۴۷ اسے زیادہ شاخیں:-

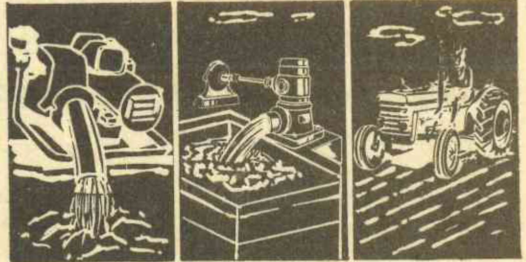


زرعی ترقیاتی بینک پاکستان

ہیڈ آفس:-
شفیع کورٹ۔ میری ویدر روڈ۔ کراچی







PRESTIGE A.D.B.P.102/8,70



دنیا میں مسلح جدوجہد



چار لاکھ بیس ہزار دشمن ویتنام میں ہلاک کئے گئے

وہاب صدیقی

جنوبی ویت نام کی پہاڑی نے نگوین سے توپیں داغی گئیں۔ ان کی گونج میں گولان کی پہاڑیوں اور دریائے اردن کی وادی سے بلند ہونے والے دھماکوں کی گونج بھی شامل ہوگئی۔ افریقہ کے جنگلوں میں حریت پسندوں نے فتح و نصرت کے پرچم لہرائے۔ ان کے قدموں کی چاپ اور نقارے کی صدا لاطینی امریکہ میں انڈیز کے گوریلوں کے جوشیلے نعروں اور مشین گنوں کی گولیوں میں سنائی دی۔ مئی ۱۹۷۰ء سے مئی ۱۹۷۱ء کا زمانہ حریت پسندوں گوریلوں کا زمانہ ہے۔ یہ زمانہ ان کے لئے فتح و نصرت کی نوید لایا۔ فتح، کامرانی اور کامیابی ان کے قدموں میں نچھاور ہوئی۔ "بندوق کی نالی طاقت کا سرچشمہ ہے" اور "انقلاب ایک تشدد آمیز عمل ہے" چیئرمین ماؤزے تنگ کے آفاقی نظریات محکوم قوموں کے لئے مشعلِ راہ بن گئے۔

آزادیٔ وطن اور سامراجی استحصال کے چنگل سے نکلنے کے لئے ویت نام، لاؤس اور کمبوڈیا کے عوام نے سامراج اور پٹھو حکومت پر بھرپور حملے کئے۔ برما، ملایا، فلپائن، تھائی لینڈ، انڈونیشیا، سیلون اور بھارت کے عوام قومی آزادی کے لئے ہتھیار بند ہو کر میدانِ عمل میں کود پڑے۔ دوفار، اومان میں برطانوی نوآبادکاروں کے خلاف مسلح جدوجہد تیز ہوئی۔ انگولا، موزمبیق، زمبیا اور کینیا میں برطانوی اور پرتگالی نوآبادکاروں کے خلاف عوام نے نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ عرب فدائین نے امریکی سامراج، اس کی ناجائز اولاد اسرائیل اور سامراج کے پٹھو شاہ حسین کے خلاف اپنی جدوجہد کو آگے بڑھایا۔

ارضِ چی گویرا، لاطینی امریکہ سامراج کے ایک نئے مدفن میں تبدیل ہوگیا۔ ترکی اور ایران کے انقلابی اپنے تاریخی فریضہ کی تکمیل کے لئے میدانِ عمل میں اترے۔ دنیا کے تیس ممالک میں اس وقت عوامی مسلح جدوجہد ہو رہی ہے اور بعض ممالک کے عوام اس انقلابی راستے پر گامزن ہونے کی تیاری کر رہے ہیں۔

مئی ۷۱-۱۹۷۰ء میں مغربی یورپ، شمالی امریکہ کے کروڑوں طلبہ، مزدوروں اور کسانوں نے مظاہرے کئے، ہڑتالیں کیں۔ اور اس طرح سامراجی استحصال کے خلاف بھرپور نفرت کا اظہار کیا۔ امریکی سامراج کے جنگی جنون کے خلاف امریکہ کے طلبا، اور محنت کشوں نے زبردست مظاہرے کئے۔ جگہ جگہ پولیس اور فوج کا مقابلہ کیا۔ وائٹ ہاؤس کے سامنے ویت کانگ کا سرخ پرچم لہرا دیا۔ چیئرمین ماؤزے تنگ اور چی گویرا کی تصاویر وائٹ ہاؤس کے سامنے لگا کر "سامراج کاغذی شیر ہے" کے مقولے کی صداقت کو ثابت کر دیا۔ جاپانی طلبہ اور عوام نے امریکی سامراج اور اپنے جنگ باز حکمرانوں کے خلاف اپنی جدوجہد کو آگے بڑھایا۔ جاپان کی فضا "امریکی سامراج مردہ باد" "جاپانی جنگ باز مردہ باد"، "یانکیوں ایشیا سے نکل جاؤ" کے نعروں سے گونج اٹھی۔

افریقہ میں
سامراج کے خلاف
جنگ جاری ہے

اس سال دنیا کے ہر حصے میں انقلابی تبدیلیاں ہوئیں۔ اور عوام کو یقین ہوگیا کہ "دنیا ترقی پذیر ہے مستقبل روشن ہے اور کوئی طاقت بھی تاریخ کے اس اٹل فیصلے کو روک نہیں سکتی۔"

ویت نام

"ہر انقلابی کے لئے ضروری ہے کہ وہ سامراج کے خلاف جدوجہد کرے" کے جذبے سے سرشار جنوبی ویت نام کے عوامی محاذ آزادی نے مئی ۷۱-۱۹۷۰ء کے دوران ۴ لاکھ بیس ہزار دشمنوں کو ہلاک اور زخمی کیا۔ اس میں امریکی فوجیوں کی تعداد ایک لاکھ دس ہزار تھی۔ نکسن ٹولے نے ویت نام کی دلدل سے نکلنے کے لئے اپنی پوری قوت ویت نام میں جھونک دی۔ شہروں کو کھنڈرات اور دیہات کو ملبے کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا اور شمالی ویت نام پر متعدد بار بھاری بمباری کی لیکن ہر حملے میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ بلکہ ویت نامیوں کا جذبۂ حریت اور ابھرا۔ جنرل گیاپ نے کہا: "جب تک ایک بھی امریکی ویت نام کی سرزمین پر ہے ہم ہتھیار نہیں رکھیں گے۔" ۱۰ر دسمبر ۷۰ء کو ویت نامی ورکرز پارٹی نے سامراج کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھنے کا اعادہ کرتے ہوئے فتح و نصرت کا مژدہ سنایا۔

لاؤس

ہند چینی میں امریکی سامراج کے خلاف دوسرا بڑا محاذ لاؤس ہے۔ یہاں گزشتہ پندرہ سال سے عوام مسلح جدوجہد میں مصروف ہیں۔ ۶ر جنوری ۱۹۷۱ء کو لاؤس کی قومی محاذِ آزادی کی سالگرہ منائی گئی۔ صرف ۱۹۷۰ء



فدائین نے اسرائیل کو ایک دن بھی چین لینے نہیں دیا

سے اب تک لاؤس کے حریت پسندوں نے امریکی سامراج اور پٹھو حکومت کے ۱۶ ہزار چار سو سپاہی ہلاک اور ایک ہزار گرفتار کئے۔ ۸۰۰ طیارے، ۱۱۰ فوجی گاڑیاں اور ۱۴۴ توپیں تباہ و برباد کیں۔ ۵ ہزار ٹن گولہ بارود کو نذر آتش کیا اور ۴۵۰۰ ہتھیار دشمن سے چھین لیتے ہیں

کمبوڈیا

امریکی سامراج نے ویت نام میں اپنی جارحانہ جنگ میں شکست سے سبق حاصل کرنے کی بجائے ہند چینی میں جنگ کے شعلوں کو اور بھڑکا دیا۔ سی۔ آئی۔ اے کی سازش پر نکسن نے اپنی فوج کو کمبوڈیا میں جھونک دیا۔ غدارِ وطن اور سامراجی پٹھو لون نول سے گٹھ جوڑ کر کے محبِ وطن اور سامراج دشمن پرنس سہانوک کی غیر موجودگی میں کمبوڈیا پر غاصبانہ قبضہ کر لیا لیکن کمبوڈیا کے حریت پسندوں نے سخت مزاحمت کی اور وہ امریکی سپاہی جو صدر نکسن کے اعلان کہ "ویت نام سے امریکی فوجیں واپس بلالی جائیں گی" وطن واپس جانے کے خواب دیکھ رہے تھے کمبوڈیا میں کام آئے۔ امریکہ کو یہاں بھی منہ کی کھانی پڑ رہی ہے۔ کمبوڈیا کے گوریلے امریکی فوجی اڈوں پر تابڑ توڑ حملے کر رہے ہیں۔

کمبوڈیا کا انقلاب دنیا کے انقلابیوں کو دوست اور دشمن کی تمیز کرنے میں مدد دیتا ہے۔ جب پرنس سہانوک کو محرومِ اقتدار کیا گیا تو وہ روس کے وعدے پر تھے، روس نے ان کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ وہ عوامی جمہوریہ چین چلے آئے اور یہاں جلاوطن حکومت بنائی جسے چین نے فوراً تسلیم کر لیا لیکن سوویت یونین اسے تسلیم کرنے سے ابھی تک گریز کر رہی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کرملین اب سامراج کا حواری بن چکا ہے اور اس سے انقلابی کردار کی توقع رکھنا محض حماقت اور نادانی ہے۔

مشرقِ وسطیٰ

مشرقِ وسطیٰ میں محاذِ آزادی فلسطین امریکی سامراج، اسرائیلی توسیع پسندوں اور سامراج نواز شاہ حسین سے برسرِ پیکار ہیں۔ جنگ جون ۱۹۶۷ء کے بعد فدائین نے بقول موشے دایان اسرائیل کو ایک دن بھی چین لینے نہیں دیا تھا۔ اسرائیل سب سے زیادہ فدائین سے خوفزدہ ہے چنانچہ ان سے نمٹنے کے لئے امریکی سامراج نے "عربوں کو عربوں سے لڑانے" کی پالیسی پر عمل کیا۔ اس نے شاہ حسین کو اسلحہ اور طیارے فراہم کئے اور یہ اسلحہ ان عربوں کو شہید کرنے میں کام آیا جن کی بندوقوں کا رخ یروشلم کی طرف تھا۔ گزشتہ ستمبر میں شاہ حسین اور اس کی بدو فوج نے چنگیز اور ہلاکو کے مظالم کی یاد تازہ کر دی اور اب بھی شاہ حسین فدائین کا قتلِ عام کر رہے ہیں لیکن شاہ حسین میں اتنی ہمت اور طاقت نہیں کہ وہ تاریخ کا فیصلہ بدل سکیں۔ سامراج اور اس کے ایجنٹوں کے دن گنے جا چکے ہیں۔ موت اور شکست ان کا مقدر بن چکی ہے۔

افریقہ

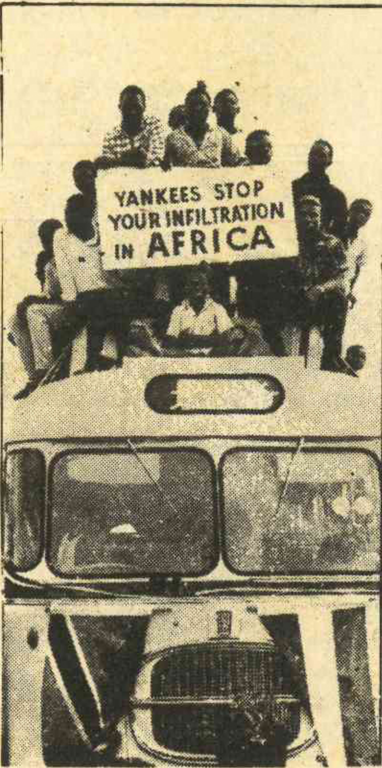
افریقہ کے عوام برطانوی اور پرتگالی نوآبادکاروں کے خلاف مسلح جنگ کر رہے ہیں۔ انگولا کے عوام گزشتہ دس سال سے نوآبادکاروں سے برسرِ پیکار ہیں۔ اس سال جنوری میں انگولا قومی محاذ آزادی کی دس سالہ سالگرہ منائی گئی۔ گنی حکومت کے ترقی پسندانہ اقدامات کو روکنے کے لئے پرتگال نے اس پر جارحانہ حملہ کیا۔ لیکن منہ کی کھانی پڑی۔ اس کے علاوہ ۱۹۷۱ء کے اوائل میں سیرالیون میں سامراج کے اشارے پر ایک سامراج نواز فوجی گروہ نے حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ کیونکہ سیرالیون کی عوام دوست حکومت نے ہیرے کی کانوں اور دوسری معدنی وسائل کو قومی ملکیت میں لینے کی کوشش کی تھی۔ اس اقدام سے امریکی سامراج کے مفادات کو چوٹ لگی تھی۔ چنانچہ سیرالیون کی آل پیپلز کانگریس کے سامراج دشمن اقدامات کو بے اثر بنانے کے لئے سی آئی اے نے حکومت کے خلاف پروپگنڈہ شروع کر دیا ہے۔ اور چند زرخریدوں سے نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی قائم کروائی۔ اور اس پارٹی نے چند سامراج نواز فوجی افسروں کی مدد سے حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جو ناکام رہی۔

پورے افریقہ میں سامراج کے خلاف جنگ جاری ہے اور یہ اُس وقت تک جاری رہے گی جب تک استحصالی نظام کو ختم کر کے غیر طبقاتی معاشرہ قائم نہیں ہو جاتا۔

بھارت

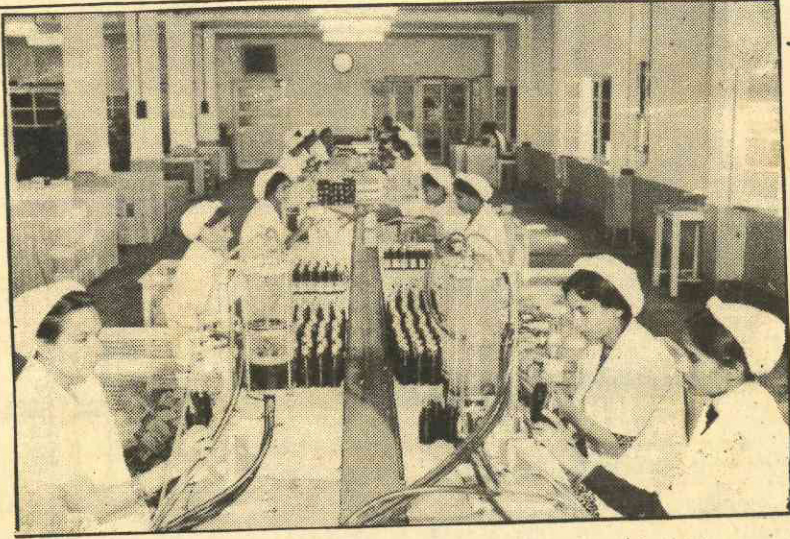
بھارت میں انڈین کمیونسٹ پارٹی (مارکسی لیننی) کی قیادت میں مسلح جدوجہد جاری ہے۔ اندھرا پردیش اتر پردیش میں انقلابی تحریک پورے عروج پر ہے۔ ہندوستان کے انقلابی اتنے جیالے اور بہادر ہیں کہ وہ بھارت پولیس اور فوج سے ہتھیار چھین لیتے ہیں اب مغربی بنگال میں پولیس کے سپاہی پہرہ دیتے وقت اپنی بندوق کو ایک زنجیر کے ذریعے کمر سے باندھتے ہیں کیونکہ انہیں خطرہ ہوتا ہے کہ انقلابی ان کی بندوقیں اڑا نہ لیں۔ اب انقلابی تحریک ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی پھیل رہی ہے۔

ان ممالک کے علاوہ ملایا، برما، انڈونیشیا، تھائی لینڈ، فلپائن، سیلون، ایران اور ترکی کے عوام سامراج اور اس کے ایجنٹوں کے خلاف مسلح جدوجہد کر رہے ہیں۔



پاکستان میں بیماری، غم اور تکلیف کے خلاف جہاد

خالد لطیف



ہمدرد لیبارٹریز کے ایک پیکنگ ہال کا منظر خون صاف کرنے کی قدرتی دوا "صافی" آٹومیٹک مشینوں کے ذریعہ پیک کی جارہی ہے

ہمدرد کا بنیادی مقصد صحت عامہ کے مسائل کو حل کرنا ہے۔ ابتداء سے یہ ادارہ معالجاتی وانسدادی تدابیر میں منہمک ہے۔ تاکہ انسانی جسم ودماغ کو امراض کے بُرے اثرات سے محفوظ رکھا جاسکے۔ ہمیشہ سے ہمدرد صاف ستھری اور صحت مند زندگی کو فروغ دینے کے لئے مصروف ہے۔ مختصر طور پر ہمدرد اس جہاد کی علامت ہے جو پاکستان میں بیماری، غم اور تکلیف کے خلاف جاری ہے۔ ہمدرد ایک ایسے طریق علاج کا علمبردار ہے جو اس سرزمین کے لئے غیر نہیں ہے۔ دوسرے ممالک کا اپنا مخصوص طریق علاج ہے۔ بالکل اسی طرح ان کا ایک خاص مذہب، تہذیب اور روایات ہیں۔ طب چین سے کون واقف نہیں۔ برما اور سیلون کا طریق علاج سدھا کے نام سے معنون ہے۔ ہندوستان میں آیورویدک رائج ہے۔ اسی طرح پاکستان میں طب مشرق صدیوں سے عوام میں مقبول ہے۔

طب مشرق پاکستان کے عوام کی صحت کے بیشمار مسائل کا واحد حل ہے۔ یہ ان کے مزاج کے موافق بھی ہے۔ اور ان کی ضروریات کا بے مثل جواب بھی۔ یہ ایک متحرک ترقی پذیر اور جاندار طریق علاج ہے۔ جس کا ماضی شاندار اور مستقبل تابناک ہے۔ گزشتہ ایک ہزار سال سے طب مشرق کے خزانہ میں تحقیق وتجربہ کے سبب برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اس طریق کار کا دارومدار گو جڑی بوٹیوں۔ چھال اور بیج پر ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ طب میں بیمار اور مفلوج انسانوں کا فطری علاج بھی ہوتا ہے۔

چند مخلص رفقائے کار کی معیت میں حکیم محمد سعید صاحب نے یہ ادارہ ۱۹۴۸ء میں قائم کیا۔ اس وقت ہمدرد کے وسائل انتہائی محدود تھے۔ طب کے فروغ کے لئے حالات بہت ناسازگار تھے۔ مگر ہمدرد کے بانی کے خلوص، لگن اور جہد مسلسل سے بہت جلد یہ ایک عظیم قومی ادارہ بن گیا۔ پاکستان کے ابتدائی برسوں میں حکومت نے کھلے عام لائسنس کے تحت دواؤں کی درآمد کی اجازت دے رکھی تھی۔ اس پالیسی کا اثر قومی معیشت اور زرمبادلہ کے محفوظات پر بھی پڑا۔ صورتِ حال پر قابو پانے کے لئے درآمد پر پابندی عائد کی گئیں اور دواسازی کی صنعت کو فروغ دینے کے لئے ایسے قدم اٹھائے گئے کہ ملک جلد از جلد دواؤں کے معاملے میں خود کفیل ہو سکے۔ نئی حکمت عملی نے فارماسیوٹیکل انڈسٹری کی ترقی کے لئے سازگار فضا پیدا کی۔ ادارہ ہمدرد پر بھی اس کا خوشگوار اثر پڑا۔ اس نے بہت جلد دواسازی کی قومی صنعت میں اپنے لئے ایک اہم مقام پیدا کر لیا اور آج ہمدرد کا عملہ آٹھ سو سے زیادہ سائنسدانوں۔ کیمسٹوں۔ دواسازوں طبیبوں اور دیگر افراد پر مشتمل ہے۔

الف ۔ طب مشرق کا وہ قیمتی خزانہ جو بوعلی سینا۔ رازی۔ ابنِ رشد۔ زہروی۔ ابن بیطار۔ جابر ابنِ حیان حکیم اجمل خان اور حکیم عبدالمجید دہلوی جیسے طبیبوں کی محنتوں کا نتیجہ ہے۔ سائنسی نقطہ نظر سے اسکی تحقیق کرنا۔

ب ۔ مغربی ومشرقی پاکستان کے ان دُورافتادہ علاقوں میں جہاں علاج معالجہ کی سہولتیں عوام کو دستیاب نہیں مریضوں کی خدمت کرنا۔

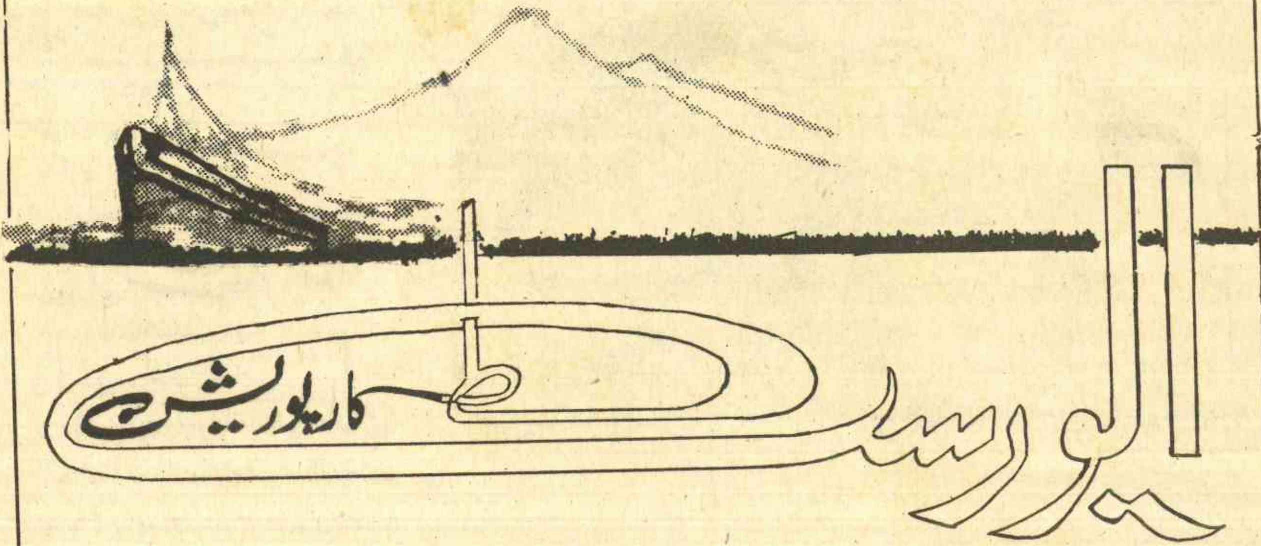
ج ۔ ملک میں جڑی بوٹیوں کے وسیع ذخیرہ کو مناسب استعمال میں لانا۔

یہ ان مقاصد سے گہری وابستگی کا ہی نتیجہ تھا کہ حکیم محمد سعید دہلوی نے ۱۹۵۳ء میں اپنی ذاتی ملکیت ہمدرد کو وقف میں تبدیل کر دیا اب ادارہ کی تین چوتھائی آمدنی طبِ مشرق کی ترقی اور اس کی تعلیم پر صرف ہو رہی ہے۔ ۱۹۵۸ء میں جامعہ طبیہ شرقیہ کا قیام پاکستان میں دیسی طب کی تعلیم کو فروغ دینے کی طرف ایک اہم قدم تھا۔ اس کے علاوہ حفظانِ صحت کا صحیح شعور پیدا کرنے کی غرض سے ادارہ کی طرف سے اردو۔ انگریزی۔ بنگالی۔ فارسی اور عربی میں جریدے شائع ہو رہے ہیں۔ ہمدرد کے مطب کراچی۔ لاہور۔ راولپنڈی۔ پشاور۔ ڈھاکہ اور چٹاگانگ میں تجربہ کار اور حاذق طبیبوں کی نگرانی میں کام کر رہے ہیں۔

ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن نے انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ اینڈ طبی ریسرچ بھی قائم کیا ہے۔ یہ ایک عظیم ترین منصوبہ ہے جس کی تکمیل پر پانچ کروڑ روپیہ خرچ ہوگا۔

ہمدرد نے دیسی طریقِ علاج کو فروغ دینے کے لئے ملک میں جڑی بوٹیاں تلاش کی ہیں اس تلاش و جستجو کے سبب بہت سی جڑی بوٹیوں کا وہ بے بہا خزانہ جو لاعلمی کے باعث ضائع ہو جاتا تھا دواسازی کے کام آ رہا ہے اس سے دو مفید نتائج برآمد ہوئے ہیں ایک طرف تو زرمبادلہ کی وہ رقم جو ان اجزاء کی درآمد پر صرف ہو رہی تھی اس کی بچت ہوئی اور دوسری طرف سینکڑوں آدمیوں کے لئے روزگار کی نئی راہیں کھل گئیں۔ جہاں جہاں جڑی بوٹیاں پائی جاتی ہیں وہاں مقامی باشندوں کو یہ ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ انہیں ضائع نہ ہونے دیں بلکہ جمع کریں۔ ہمدرد کے کارکن آکر سارا مال ان سے

باقی صفحہ ۹۶ پر ملاحظہ فرمائیں


ایورسٹ
کارپوریشن



کھیل کے میداں مرثیہ خواں ہیں کہ کھلاڑی نہ رہے

لطافت علی صدیقی

مسجدیں، مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے۔

یہ مصرعہ کھیل کے میدانوں اور اسٹیڈیم پر بھی صادق آتا ہے۔ کھیل کے میدان مرثیہ خواں ہیں کہ کھلاڑی نہ رہے۔ بمشکل سے کسی گراؤنڈ پر کھلاڑی حرکت میں نظر آئیں گے۔ اس کی بڑی وجہ کھیل کے وہ نام نہاد عہدیدار ہیں جو کھیل کو مقبول بنانے کی بجائے دن رات اپنے مفادات کے چکر میں پھنسے رہتے ہیں۔ آپ کے ذہن میں سوال یقیناً ہوگا کہ آخر انہیں اس قسم کے اعزازی کاموں سے کیا فائدہ ہوتا ہوگا۔ اس مسئلے پر ہم بعد میں بات کریں گے فی الوقت تو مجھے یہ کہنا ہے کہ ملک کا سب سے خوبصورت اسٹیڈیم، کراچی آرمی اسٹیڈیم کو جو ہاکی کلب آف پاکستان اسٹیڈیم کے نام سے زیادہ مقبول ہے۔ زیادہ بہتر طریقے سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کھیلوں کے اعزازی عہدیدار یہاں ہاکی کوچنگ کیمپ کا انتظام کر سکتے ہیں، لیکن یہ کام نہیں کیا گیا اس کی بڑی وجہ ہاکی کے وہ باس ہیں جو کھیل کی تقریباً تمام مقامی تنظیموں پر غاصبانہ تسلط جمائے بیٹھے اور اپنا تمام وقت فٹ بال فرنٹ کے نوجوان باغیوں کو کچلنے اور ان کا صفایا کرنے میں صرف کرتے ہیں، انہیں اس کام سے اتنی مہلت ہی نہیں ملتی کہ وہ اپنا تھوڑا سا وقت نوجوان کھلاڑیوں کی تربیت پر دیں۔ وہ فٹ بال محاذ کے جن باغیوں کو کچلنے کی کارروائی میں مصروف ہیں، دراصل وہی "لیاری" "فٹ بال کی روح" رواں ہیں۔ اس تنظیم کو چلانے کا وہی قانونی اور اخلاقی حق رکھتے ہیں، ان کے خلاف نام نہاد باسوں کی معاندانہ کارروائی محض اسلئے جاری ہے کہ وہ باغی ہیں جنہوں نے قوم کو بین الاقوامی معیار کے کھلاڑی دیئے ہیں۔ ہاکی اور فٹ بال پر اجارہ داری قائم رکھنے والے مسٹر رشید تبسم نے قوم کو کیا دیا۔؟ اگر یہ سوال ان سے اور ان کے ہوا خواہوں سے کیا جائے تو شاید ان کی عرق آلود پیشانی کے سوائے دوسرا کوئی جواب نہ ملے۔

ممکن ہے اس مسئلہ کے حل کی کوئی صورت نکل آئے، کیونکہ اس علاقے سے قومی اسمبلی کے منتخب نمائندے مسٹر ستار گبول نے واضح الفاظ میں اعلان کیا ہے کہ "فٹ بال کے سارے معاملات کی تحقیقات کی جانی چاہیئے"۔ اس کے لئے انہوں نے ایک ایڈہاک کمیٹی بنانے کا مطالبہ بھی کیا۔

اس مسئلے کو سندھ حکومت کی صوابدید پر چھوڑ کر ہم اصل مسئلے یعنی شہر کے ویران اسٹیڈیم کی طرف آتے ہیں۔

بہت انتظار کے بعد ہاکی کلب آف پاکستان اسٹیڈیم کے انچارج نے نوجوان کھلاڑیوں کے لئے ہاکی کے ایک تربیتی کیمپ کا خود اعلان کیا ہے۔ اس کیمپ میں شریک ہونے والے سے کوئی فیس نہیں لی جائے گی۔ یہ پہلا موقع ہے کہ کسی اسٹیڈیم کی جانب سے کھیل کی حوصلہ افزائی کے لئے اس انداز میں پہل قدمی کی گئی جب کہ متعلقہ حکام تا حال خواب غفلت کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ اسٹیڈیم کا یہ اعلان ایسا ہے جیسے کنواں خود چل کر پیاسے تک پہنچ گیا۔ کوچنگ کا یہ تازہ منصوبہ درحقیقت کراچی ہاکی ایسوسی ایشن کے منہ پر ایک بھرپور طمانچہ ہے۔ اب ہم کے ایم سی کے فٹ بال اسٹیڈیم خواجہ سلیم کے عظیم کوچنگ مرکز اور کراچی پورٹ ٹرسٹ کے بد مینٹن ہال سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ تربیتی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں آگے بڑھیں گے۔ اس بات کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ مقامی تنظیموں سے امسال روال میں ٹورنامنٹ اور کوچنگ کی امید رکھنا سراسر فریب کھانے کے مترادف ہوگا۔

آپ یقیناً سوال کریں گے کہ امسال کھیل کی مقامی تنظیمیں، اگر کوچنگ پروگرام اور ٹورنامنٹ کا انتظام نہ کریں گی تو پھر کیا کریں گی۔؟ بڑا آسان سا طریقہ اختیار کریں گی۔ اخبارات کے لئے لمبے لمبے بیانات جاری کئے جائیں گے کسی تقریب کے موقع پر اگر کوئی فوٹو گرافر مل گیا تو اسی کے اعزازی عہدیدار تصویر کے لئے پوز بنائیں گے حکومت سے بار بار اپیل کی جائے گی کہ زیادہ سے زیادہ گرانٹ دیئے جائیں تاکہ کھیل کو ترقی دینے کے ساتھ ساتھ ہمارا بھی بھلا ہوتا رہے۔ تنظیم کے اخراجات پر غیر ملکی دورے کئے جائیں گے۔ عیش اور گلچھرے اڑائے جائیں گے۔ غرض کہ کھیل کو ترقی دینے کے علاوہ باقی سارے کام ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ کھیل کے "اعزازی" کارکن بنے رہنے پر سارا زور صرف کرتے ہیں، شہرت، عزت، دولت، اعزازی کاموں سے وہ ہر چیز حاصل کرتے ہیں۔

لیکن اب حالات تبدیل ہو رہے ہیں مسٹر انوار چودھری، مسٹر اے بو ظفر، مسٹر لقی بٹ جو کھیل کے نام پر ہمیشہ غیر ملکی دوروں پر رہتے ہیں۔ زیادہ عرصہ ایسا نہیں کر سکتے۔ کھلاڑی اور ان کی یونین انہیں قومی فنڈ پر غیر ملکی دوروں سے روکنے کے لئے پوری طرح تیار ہو چکی ہیں۔

اس سلسلے میں صدر مملکت جنرل آغا محمد یحیٰی خاں سے ملنے کا پروگرام بنایا گیا ہے۔ انہیں حقیقت حال سے پوری طرح آگاہ کیا جائے گا کہ قومی کھیل کو ان پیشہ ور عہدیداروں سے کیا نقصان پہنچ رہا ہے۔ وہ اسے کس طرح تباہ کرنے پر تلے ہیں۔ اس کے علاوہ اسٹیٹ بنک کے نئے سربراہ مسٹر ایس یو درانی سے ملاقات کا پروگرام بھی بنایا گیا ہے۔ ان سے مل کر کہا جائے گا کہ ان عہدیداروں کو زرمبادلہ نہ دیا جائے کہ ملک فی الوقت مالی بحران میں مبتلا ہے۔ جائز کھیل کے نوجوان کھلاڑیوں اور ان کی یونین نے نام نہاد باسوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی جو جائز جدوجہد شروع کی ہے۔ وہ آج نہیں تو کل ایک یقینی کامیابی سے ہمکنار ہوگی۔

"ہم لوگ"

ممتاز فلمساز اور ہدایتکار ضیاء سرحدی
"الفتح" کے لئے اپنی یادداشتیں قلمبند کرتے ہیں



نئی زندگی کے آغاز کیلئے

مَیں فضل سے ضیاء سرحدی بن گیا

پشاور میں علامہ مشرقی نے جب اپنی خاکسار تحریک کا آغاز کیا تھا تو ان دنوں وہ ہمارے گھر پر ٹھہرے ہوئے تھے اور یہ وہ زمانہ تھا جب خاموشی کے ساتھ میں نے فلم کی ایک کہانی لکھنا شروع کر رکھی تھی۔

کچھ عرصہ پہلے علامہ مشرقی گورنمنٹ ہائی اسکول میں ہمارے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اور ان ایام میں دوسرے طلبا اور اساتذہ کی طرح میں بھی موصوف کی ادبی اور علمی صلاحیتوں سے بہت مرعوب تھا۔ جب مشرقی صاحب ہمارے ہاں آکر ٹھہرے تو میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی زیر تحریر فلمی کہانی ان کو پڑھنے کے لیے پیش کر دی۔ اور درخواست کی کہ وہ میری رہنمائی کریں اور مجھے مشورہ دیں کہ آیا میں اس طرح کی کوششوں کے اہل ہوں بھی یا نہیں۔ مگر مشرقی صاحب نے میری تمام توقعات کے برعکس نہ یہ کہ مجھے فلمی رجحانات سے باز رکھنے کی کوشش کی بلکہ ایک طویل لیکچر دے کر مجھے اپنی تحریک میں شامل ہونے کی ہدایت کر دی۔

فلم سازی کے فن کو مشرقی صاحب نے صنم پرستی قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ ایسے فنون زندہ قوموں کی قیادت وارتقا کے بالکل منافی ہیں۔ اور نہ صرف یہ کہ فلم کو پیشہ بنا لینا ہی بُرا نہیں۔ بلکہ فلم کو دیکھنا بھی بدترین گناہ اور ہرزہ کاری کے برابر ہے۔ ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے خیالات کا کچھ یوں بھی اظہار کیا تھا کہ خاکسار تحریک آئندہ ایام میں باقاعدہ طور پر فلموں کے خلاف ایک مہم شروع کرے گی اور خاص طور پر مسلمانوں کو اس مکروہ فن اور کاروبار سے باز رکھنے کی ہدایت کرے گی۔

اس کے بعد فلموں کے خلاف خاکسار تحریک کی مہم شروع ہوئی یا نہیں اس کا علم تو مجھے نہیں ہو سکا۔ لیکن میری حد تک اس مہم کا آغاز ضرور ہو چکا تھا۔ مشرقی صاحب کی ہدایت پر، میرے بڑے بھائی جو اُن کی تحریک کے خاص رکن تھے۔ اور جزوی طور پر تحریک کے مالی مددگار ہونے کے علاوہ صوبہ سرحد کے افسر اعلیٰ بھی تھے۔ پوری تندہی اور عزم کے ساتھ میرے خلاف صف آرا ہو گئے۔ اُن کی سپاہ میں ہمارے قریبی رشتہ داروں کے علاوہ وہ خاکسار حضرات بھی شامل تھے جو باقاعدگی کے ساتھ اس زمانہ میں ہمارے گھر آجایا کرتے تھے۔ بیک زبان اب یہ تمام لوگ اسی کوشش میں تھے کہ میں فلم کے قابل مذمت خیال کو ہمیشہ کے لئے اپنے دل و دماغ سے نکال دوں۔

مگر بایں ہمہ میرے باطن پر ان تمام پند و نصائح کا ردِعمل میرے اندیشوں کی توقعات کے بالکل برعکس ہوتا رہا۔ اور وہ ولولہ اور فلم کے ذوق کا آتش فشاں جو کچھ عرصہ سے میری روح میں اُبل رہا تھا اب بھی اُبلتا رہا۔ ادھر فلم سے دور رہنے کی ہدایت جس قدر تیزی پکڑتی گئی ادھر میرے وارفتہ دل میں سیلولائڈ کی سحر آفریں دنیا کا لگاؤ بڑھتا چلا گیا۔ اور پھر رفتہ رفتہ یہ جذبہ گھر والوں اور ان تمام لوگوں کے خلاف ایک بغاوت کی صورت اختیار کرنے لگ گیا، جو مجھ کو فلم سے منحرف کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے۔ اینٹی فلم، عناصر کی تمام تبلیغوں، تنقیدوں، تنبیہوں کے باوصف فلم کے فن کا احترام میرے دل میں لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ اور فلم سے میری شدید ذہنی وابستگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

مخالفین کے ساتھ ذہنی جنگ کے اس دور میں مجھے بخوبی یاد ہے کہ پہلی بار مجھ کو اپنی روح میں ایک اجنبی سی بیداری کا احساس ہونے لگا۔ اور میں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ میری نظر میں جو پہلے چند مقررہ حدود کے آگے نہیں جا پاتی تھیں اب ذہن کی کسی کروٹ کی وجہ سے ان حدود سے آگے نکلنے کے لئے کوشاں ہیں۔ ظاہر ہے کہ تعلیم و تربیت کے لحاظ سے میرے سیکھنے میں بھی یہی آیا تھا کہ بزرگوں کی ہدایات کو بے سوچے سمجھے قبول کر لینا سعادتمندی ہوتی ہے۔ لیکن میری روح میں اب ایک نیا جذبہ کارفرما ہونے لگا تھا۔ اور اب میں بلا تامل یہ سوچنے لگا تھا کہ وہ تمام لوگ جو مجھے صبح و شام فلمی رجحانات سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں نہ یہ کہ صرف "تنگ نظر" ہیں بلکہ منافق بھی ہیں۔ اور منافق یوں ہیں کہ انہی میں سے اکثر کو تو میں نے خود سینما گھروں میں آتے جاتے دیکھا ہے۔ اور ان کے مقدس لبوں سے میں نے بارہا فلمی نازنینوں کے حسن اور دلربائی کے تذکرے بھی سنے ہیں۔ میں نے ان میں سے کچھ ایسے پاکباز بھی دیکھے ہیں جو خود بھی ناولوں اور افسانوں کے حد درجہ دلدادہ ہیں۔ اور پھر ان میں سے بہتوں کو میں نے اُس زمانے کی گلوکار دلاریوں، چمپاؤں اور زہراؤں کے ریکارڈ بجتے وقت سر دھنتے اور وجد میں آتے بھی دیکھا ہے۔ اب اگر وہ تمام مشاغل قابل اعتراض نہیں تھے یا زندہ اقوام کے حیات وارتقا کے منافی نہیں تھے تو پھر میرا ذوق فلم کس مناسبت اور فکر کے کس زاویئے سے مکروہ یا قابل مذمت ٹھہرایا

سالنامہ

الفتح

محبوب نے پہلی ملاقات میں کہا: ”تیرے کو بھی جرور ایکٹنگ کا سوک ہوگا“

جا سکتا ہے۔ ان تمام حقائق کے پیش نظر مجھ کو یقین ہونے لگا تھا کہ ہمارا معاشرہ افسوسناک حد تک منافقت اور تصنع کا شکار ہے اور لوگوں نے کسی نہ کسی وجہ سے گمراہ کن اندھیروں کو روشنی قرار دے دیا ہے۔

مگر مجھ کو اُن اندھیروں میں، اُن سلاسل میں، منافقت اور تصنع کے اُن روایتی بحروں میں رہنا ہرگز ہرگز منظور نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں ہر قیمت پر ان سے نجات حاصل کروں گا۔ اور پرانی زندگی کے تمام رشتوں سے علیحدگی اختیار کر لوں گا۔ میرے پیش نظر اب یہ سوال تھا کہ عملی طور پر کب اور کس طرح مجھے اپنے گھر اور گھر والوں سے علیحدگی اختیار کرنی ہوگی۔ اور تاوقتیکہ میں فلم کی دنیا میں کام شروع کر سکوں، میرا ذریعہ معاش کیا ہوگا۔ میں اپنے خاندان کی قدامت پسندی اور ہٹ دھرمی سے پوری طرح واقف تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جس لمحہ بھی میں گھر سے علیحدہ ہوا۔ اسی لمحے سے گھر والوں کی نظر میں میری حیثیت کسی بدترین مجرم کی سی ہو کے رہ جائے گی۔ اور ایسی صورتحال میں گھر والوں سے معمولی سی مالی امداد کی توقع رکھنا بھی میرے لئے قطعاً ناممکن ہوگا۔ لیکن ان تمام امکانات اور خدشات کے باوجود میں اپنے فیصلے پر قائم رہا۔ اور اپنے فلمی ذوق کو میں نے برقرار رکھا۔

کچھ عرصے کے بعد ایک دن میں نے خاموشی کے ساتھ گھر سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اور عہدِ گذشتہ کے تمام رشتے کاٹ دینے کی کوشش بھی۔ میں نے یہ بھی طے کر لیا کہ میں آئندہ ’ضیا سرحدی‘ کہلاؤں گا۔ اور اپنے پرانے نام ”فضل“ کو بھی اپنی زندگی کے نئے سفر میں ساتھ نہیں رکھوں گا۔ اس وقت میرے ذہن میں اس نئے نام کے دو Advantage تھے۔ ایک تو یہ کہ اس نئے نام کی وجہ سے میں خود کو ایک نیا آدمی محسوس کروں گا اور پھر یہ کہ نام کی تبدیلی سے اگر میرے گھر والے چاہیں بھی تو یہ آسانی میرا کھوج نہیں لگا سکیں گے۔ غرضیکہ گھر والوں کے تعاقب کے خیال سے میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ تاحدِ امکان میں ایک Fugetive بنکے اپنی تگ و دو کا آغاز کروں گا۔

گھر سے علیحدہ ہونے کے چند ہی روز بعد میں ایک نوعمر Fugetive یعنی ضیا سرحدی لاہور پہنچا۔ اور اس طرح سے میں نے اپنی فلمی تگ و دو کا آغاز کیا۔ لاہور میں میں اپنے ایک صحافی دوست مسٹر ہاشمی کا مہمان رہا۔ اور پھر اس کے بعد میں نے بمبئی کا رُخ کیا۔ جو اُس زمانے میں ہندوستان کا ہالی وُوڈ سمجھا جاتا تھا۔

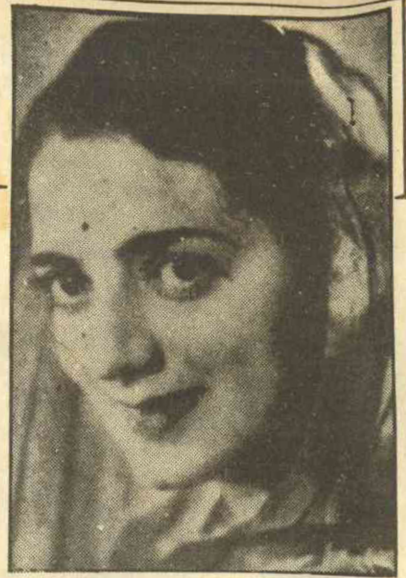
بمبئی پہنچتے ہی میں نے نگار خانوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ مگر بار بار یہی ہوتا رہا کہ مجھے اُن کے دروازوں تک جا کر لوٹ جانا پڑا۔ اُس زمانے میں بھی نگار خانوں میں لوگوں کی آمد و رفت پر خاصی پابندیاں تھیں۔ اور بغیر کسی پہچان یا وسیلے کے سٹوڈیوز کے اندر تک جانا تقریباً ناممکن تھا۔

اس مشکل کے پیش نظر اب میرے لئے کسی وسیلے کی تلاش لازمی ہو گئی۔ اور کچھ عرصے کے لئے نگار خانوں کی اطراف میں گھومنے کے بجائے میں نے ایسے خضر کی تلاش شروع کر دی جو مجھے منزل تک پہنچا سکے۔ ان دنوں میں بمبئی کے دو روپے روز والے ایک ہوٹل میں مقیم تھا اور پچھلے دو ہفتے سے میرے سر پر کرائے کا بار بھی بڑھنے لگا تھا۔ ہوٹل کا مالک اب بار بار تقاضا کرنے لگا تھا۔ بلکہ اس نے نوٹس دے دیا تھا کہ تین روز کے اندر اندر اگر میں نے اس کا پچھلا حساب صاف نہ کر دیا تو مجھے ہوٹل صاف کر دینا پڑے گا۔ لاہور سے روانگی کے وقت ایک گدڑی فروش کے پاس میں نے اپنے تین قیمتی سوٹ، دو شیروانیاں، چند کوٹ اور قمیضیں بیچ کر جو ساٹھ روپے حاصل کئے تھے اُن میں سے کچھ رقم تو ٹرین کے ٹکٹ پر صرف ہو گئی تھی اور کچھ میں نے ہوٹل کے مالک کو بطور پیشگی ادا کر دی تھی۔ مختصر کھانے پینے کے اخراجات کے بعد اب میرے پاس ڈیڑھ روپیہ بچا ہوا تھا۔ باقی بچے کھچے کپڑے جو لاہور سے میں اپنے ساتھ لا سکا تھا۔ وہ بھی ایک لانڈری میں پھنس کے رہ گئے تھے۔

اور اس اعتبار سے بھی اب میں بالکل مفلس ہو چکا تھا۔ اب میرے پاس ایک پتلون اور ایک سفید سوتی قمیض کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اُدھر بمبئی میں برسات کا موسم پورے شباب پر تھا اور تقریباً آئے دن موسلا دھار بارش ہوتی رہتی تھی۔ مجھے اب کپڑوں کی قلت کی وجہ سے برسات کے حملوں سے بھی بچ کے رہنا پڑتا تھا۔ اور یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ اگر کہیں بارش میں گھر گیا تو بڑی آفت ہو جائے گی۔

اس مشکل کے پیش نظر بارہا یہ ہوتا رہا کہ مجھے دو دو تین تین گھنٹوں تک مختلف مقامات پر پناہ لینی پڑتی تھی۔ اور ایک دو مرتبہ یوں بھی ہوا کہ مجھے حد درجہ متعفن بیت الخلاؤں میں پناہ لے کر بارش کے تھم جانے کا انتظار کرنا پڑا۔ لیکن بمبئی کے بے رحم مون سون سے میں آخر کب تک بچ سکتا تھا۔ ایک دن چلتے چلتے آخر بارش نے مجھے گھیر ہی لیا۔ اور نتیجے کے طور پر میں اس حد تک بھیگ گیا کہ اُس دن مجھے اپنے خضر کی تلاش کو ترک کر دینا پڑا۔ اور مطلع صاف ہونے کے بعد بمبئی کے مشہور چوپاٹی کے ساحل پر دھوپ سینکنے اور کپڑوں کو کسی قدر خشک کرنے کے لئے تین چار گھنٹے تک بیٹھنا پڑا۔ ان حالات میں میری تگ و دو کے اب تین محاذ تھے۔ ایک فلم کا محاذ دوسرا بمبئی کا مون سون کا محاذ اور تیسرا ہوٹل کے مالک کا وہ کاؤنٹر جو ہوٹل کے صدر اور واحد دروازے کے بالکل ساتھ لگا ہوا تھا۔ اور جس کا سامنا آتے جاتے ہوتے ہر مسافر کے لئے لازمی تھا۔

فلمی دنیا کا پہلا آدمی جس سے مجھے ایک سینما گھر کے اسسٹنٹ مینجر مسٹر ارمان نے ملوایا تھا وہ محبوب تھا۔ جو ہنوز ڈائرکٹر نہیں تھا۔ ساگر فلم کمپنی کے سائڈ رولز کرنے والے ایکٹروں میں سے ایک تھا مسٹر ارمان جن کے توسل سے میں نے زندگی میں پہلی بار فلم کے ایک نگار خانہ میں قدم رکھا تھا۔ محبوب کے ملاقاتیوں میں سے تھے۔ اور اس سے پہلے کہ وہ محبوب سے میرے متعلق تفصیلی طور پر کچھ کہہ پاتے۔ محبوب نے ملاقات کے چند ہی لمحوں کے بعد اپنی بمبئیانہ اردو میں مجھ کو مخاطب



تمام لوگ مؤدّب ہوگئے، ہیروئن سیتا مسکراتی ہوئی اُوپر چلی گئی

کرتے ہوئے کہا "تیرے کو بھی جرور ایکٹنگ کا سوک ہوگا۔ یہ سالا بڑا ظالم سوک ہے"

بعد میں جب مسٹر ارمان نے محبوب کو بیرے مقصد کی وضاحت کرکے اُس کو بتایا کہ میں نے ایک فلمی کہانی لکھ رکھی ہے۔ اور میں اسی کہانی کے سلسلہ میں آیا ہوں اور میری خواہش ہے کہ وہ کہانی اسٹوڈیو کے مالکان کو پیش کی جائے تو محبوب نے بغیر کسی تامل اور تصنع کے اسٹوڈیو اونر کے آفس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تلخ لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "یہ سالا سیٹھ لوگ بہت بدماس لوگ ہے۔ ان کو اپنی اسٹوری مت سناتا۔ ان لوگ کے پاس کسی کی قدر نہیں۔ ابھی میرے کو فلم لین میں گیارہ برس ہوگیا ہے اور میرے کو ڈائریکشن کا بہت سوک ہے اور میں ان لوگوں کو روج بولتا ہوں کہ سالا کبھی اپن سے بھی ڈائریکسن کرا کے دیکھو۔ اگر اپن نہیں بنا ئینگا کہ فلم ڈائریکسن کس کو بولتا ہے تو اپنا نام محبوب نہیں۔ پھر بھی دوست کوئی بات نہیں تو اپنی اسٹوری میرے کو سنا اور ایک پلاٹ میں بھی تیرے کو سناؤں گا اور اپن مل کے ایک اسٹوری بنائیں گے۔ کبھی تو اوپر والا اپنی بھی سنے گا"

ابھی محبوب گفتگو کر ہی رہا تھا کہ پورٹیکو میں ایک لیموزین آکر رکی اور اس کے ساتھ ساتھ میں نے دیکھا کہ آس پاس جتنے لوگ موجود تھے سب اس کی طرف متوجہ ہونے لگ گئے۔ کار کے رکتے ہی چند ہی لمحوں میں ساگر فلم کمپنی کی ہیروئن نمبر ایک سیتا دیوی اس میں سے نمودار ہوئی۔ کسی نے سلام میم صاحب کہا، کسی نے نمسکار کہا، کہیں سے گڈ مارننگ میڈم کی آواز سنائی دی اور ساتھ ساتھ سیتا اپنے خاص انداز میں مسکراتی ہوئی اوپر والے زینے کی طرف چلی گئی۔ سیتا کے استقبال سے ہنوز لوگ فارغ ہی ہوئے تھے کہ اتنے میں اسی راستہ سے سیتا کی موٹی، بے ڈول اور ادھیڑ عمر ماں گذرنے لگی۔ اس کے پیچھے پیچھے اسٹوڈیو کے دو چپراسی تھے جنہوں نے ایک ٹفن باکس، ایک میک اپ باکس اور دوسری کچھ چیزیں اُٹھا رکھی تھیں سیتا کی ماں کے چہرے پر ایک خاص قسم کی رعونت تھی اور میں نے یہ نوٹ کیا کہ کسی پر نگاہ ڈالے بغیر بڑی سیریس شکل بنائے ہوئے وہ اوپر کی طرف چلی گئی اس کے بعد جب میں نے مڑ کر محبوب پر نظر ڈالی تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ محبوب کی آنکھیں دشنام اور گالیوں سے لبریز ہو رہی ہیں۔

محبوب کا یہ دورِ حیات اس کی پریشانیوں کا ایک تاریک ترین دور تھا۔ ساگر سے اس کو ایک سو پچیس روپے ماہانہ تنخواہ ملا کرتی تھی۔ جس کا ایک خاصا حصّہ اس کو بیوی بچّوں کے لئے اپنے گاؤں بلی مورا بھیج دینا پڑتا تھا۔ گھر والوں کے اصرار پر اُس کی شادی چھوٹی عمر ہی میں کروا دی گئی تھی۔ اور چھوٹی عمر میں ہی اس کے ہاں کچھ بچے بھی پیدا ہوگئے تھے اور اس صورت میں کہ پیش از وقت ذمہ داریوں کو برداشت کرنے کی سکت اس کے کاندھوں میں نہیں تھی۔ وہ حد درجہ پریشان رہتا تھا۔ فلمی دنیا میں آنے سے پہلے اس نے اپنے گاؤں میں بیکاری کی ایک طویل مدّت گذاری تھی اور اس بیکاری کے زمانہ میں بقول اُسی کے وہ ایک حد تک تشدد پسند بننے لگا تھا۔ اور اکثر اوقات لوگوں کے ساتھ مار پیٹ بھی کر لیا کرتا تھا آگے چل کر اُس کو یہ محسوس ہونے لگا کہ نہ صرف اپنے گھر والوں کے لئے بلکہ گاؤں والوں کے لئے بھی وہ قابلِ قبول نہیں رہا۔ اس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد اس نے بمبئی منتقل ہونے کا فیصلہ کیا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد وہ بمبئی آگیا۔ بمبئی آنے کے بعد امپیریل فلم کمپنی میں کسی نہ کسی طرح اس نے ایکسٹرا کی حیثیت سے چالیس روپے ماہانہ پر کام شروع کر دیا۔ اور اس طرح سے اس کی فلمی زندگی کی ابتدا ہوئی۔

چند سال امپیریل فلم کمپنی میں کام کرنے کے بعد محبوب امپیریل کے چند دیگر ایکٹروں ایکٹریسوں، ٹیکنیشنز اور سٹاف کے کارکنوں کے ہمراہ ساگر فلم کمپنی میں منتقل کر دیا گیا تھا اور یہ ساگر فلم کمپنی بھی امپیریل ہی کی ایک شاخ تھی جو غالباً انکم ٹیکس سے بچنے کے تئے مصلحتاً قائم کر دی گئی تھی۔ سٹاف کے جو لوگ اب ساگر کے پرچم کے نیچے آ گئے تھے ان میں قابلِ ذکر چند شخصیتیں تھیں جن میں اس زمانے کی مشہور اداکارہ زبیدہ اور ہیرو جال مرچنٹ سرِفہرست تھے۔ ساگر فلم کمپنی میں آنے کے بعد محبوب کو پروموشن مل گئی تھی۔ اور اب وہ ایکسٹرا نہیں بلکہ سائڈ رولز کرنے والا اداکار بن چکا تھا۔ اُس دور کی فلموں میں محبوب مقابلتاً فلم "زرینہ" کا تذکرہ زیادہ کیا کرتا تھا اور وہ اس لئے کہ یہ فلم اُس زمانے کی تجرباتی فلم کہلاتی تھی۔ تجرباتی اس اعتبار سے کہ اس میں امریکی اور یورپی فلموں کی طرح ہیروئن زبیدہ اور ہیرو جال مرچنٹ کو بوسوں کی مکمل آزادی دے دی گئی تھی اور سنا ہے اس فلم میں تقریباً ساٹھ ستر بوسے فلم بین طبقے کی تفریح کے لئے پروائڈ کئے گئے تھے۔ دوسری خاص بات جو اس فلم سے منسوب کی جاتی تھی وہ اس فلم کی جدید طرز کی ایڈیٹنگ تھی۔ کہتے ہیں کہ عذرا میر نے جو اس فلم کا ڈائریکٹر تھا اور جس نے امریکہ میں ایڈیٹنگ کی ٹریننگ حاصل کی تھی اس فلم کی Cutting میں بڑی خوش اسلوبی اور نفاست سے کام لیا تھا۔ آر ایس چودھری اور اس کے ہمعصر دوسرے چند ہدایت کار اگرچہ عذرا میر سے پہلے غیر ملکی تصویروں کو دیکھ دیکھ کر اور ان کی تقلید میں ہندوستانی فلموں کو بھی ایڈیٹنگ کی نئی ڈگر پر چلانے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ مگر وہ تخلیقی رنگ جس کا آغاز عذرا میر نے کیا تھا ان لوگوں کی پہنچ سے ہنوز دُور تھا۔ عذرا میر کی اس مخصوص سُوجھ بُوجھ سے سنا تھا کہ ساگر کے متعلقہ لوگوں نے بقدرِ شوق فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی تھی مگر عذرا میر نے ایک یا دو پیشہ ور ایڈیٹروں کے علاوہ کسی کو اپنی ایڈیٹنگ کی میز پر گوارا نہیں کیا تھا۔ مگر محبوب نے فلم زرینہ کے آخری مراحل میں عذرا میر کو کسی نہ کسی طرح راضی کر لیا

تھا اور اس طرح سے چند روز کے لئے ان کو عذرا میر کے ایڈیٹنگ روم میں آنے کی اجازت مل گئی تھی بعد میں محبوب کو جب ڈائریکشن کے مواقع ملنے لگے تو ایک طویل عرصہ تک وہ ایڈیٹنگ کے معاملہ میں عذرا میر کی تقلید پہ قائم رہا۔ اور اس نے مدت دراز تک اپنے ساتھ فقیر محمد نامی ایڈیٹر کو رکھا جو عذرا میر کے گنے چنے دو یا تین شاگردوں میں سے ایک تھا۔

جس زمانے میں میری محبوب سے ملاقات ہوئی یا یہ کہ جب میری فلمی زندگی کا آغاز ہوا، ہندوستانی فلم سازی اس وقت ایک نئے دور میں داخل ہو رہی تھی۔

انگریزوں کے خلاف ہندوستان کی جنگ آزادی کافی حد تک زور پکڑ چکی تھی اور کچھ فلم ساز اب قومی مضامین کی فلمیں بھی بنانے لگے تھے۔ ان نئے رجحانات اور تقاضوں کی وجہ سے جدید فکر و نظر کے لوگوں کی مانگ بڑھنے لگی تھی اور اس کے نتیجے میں انڈسٹری کے پرانے اور فرسودہ خیالات کے لوگ ہندوستانی فلم کے سٹیج سے اب آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگ گئے تھے

ان حالات کے پیش نظر ہندوستان کا فلم ساز اب مجبور تھا کہ وہ نئے Talent اور نئے فکر و نظر رکھنے والے لوگوں کو فلم سازی کے مواقع فراہم کرے۔ اور نئے دماغوں کو آزمائے۔ محبوب اگرچہ تعلیمی اعتبار سے نہایت درجہ پسماندہ آدمی تھا۔ مگر زندگی کے عملی مکتب میں اس کو خاصا درس مل چکا تھا اور وہ اس بات کا حد درجہ آرزومند تھا کہ اگر اس کو فلم سازی کے مواقع فراہم کئے گئے تو وہ ضرور ایسی تصویریں بنائے گا جن میں ہندوستانی عوام کے مسائل اور اس کے قومی جذبے کی ترجمانی ہو۔ محبوب اگرچہ اپنی ابتدائی تصاویر میں ان خیالات کو بہت ہی کم حد تک Implement کر سکا تھا۔ مگر بعد کے دور میں اس کی چند تصویروں کے بارے میں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس کے پرانے خوابوں کی ترجمانی میں ایک حد تک ضرور کامیاب ہوئیں۔

پہلی ہی ملاقات میں میری اور محبوب کی کامریڈشپ اور دوستی کا آغاز کچھ ایسی استوار بنیاد دل پر شروع ہوا کہ اس کے بعد چند روز ہی میں ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے اور کچھ عرصے تک اپنے فلمی مستقبل کے خوابوں میں ایک دوسرے کے شریک رہے۔

(باقی آئندہ)

قومی تھیٹر

پاکستان میں جان بوجھ کر قومی تھیٹر کو پنپنے نہیں دیا گیا

کچھ اسلام پسند دانشوروں نے کہا:
'ہمارے ہاں ڈرامہ کی روایت ہی نہیں'

علی احمد

اب سے ۱۰ سال پہلے مغربی پاکستان کے دو بڑے شہر لاہور اور کراچی میں سال میں اوسطاً چھ اسٹیج ڈرامے ہوا کرتے تھے۔ لیکن اب یعنی دس سال بعد انہیں شہروں میں اسٹیج ڈراموں کی تعداد تقریباً چوگنی ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ پنڈی پشاور، ملتان، حیدرآباد اور دوسرے شہروں میں بھی اسٹیج ڈراموں کی تعداد میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ مشرقی پاکستان میں ڈراموں کی تعداد اور بھی زیادہ ہے۔ وہاں آئے دن بنگلہ ڈرامے ہوتے رہتے ہیں۔ ان ڈراموں نے جہاں ایک طرف قومی تھیٹر کی تحریک کو آگے بڑھایا ہے۔ وہاں دوسری طرف بہت سے خوررو اور با صلاحیت فنکار بھی پیدا کئے ہیں۔

موضوع کے اعتبار سے اب تک تین اقسام کے ڈرامے ہوتے ہیں۔

اوّل ایسے ڈرامے جن میں جاگیردارانہ اقدار کو اچھالا جاتا ہے۔ بادشاہوں، شہزادوں، رئیسوں اور ان کے لڑکے لڑکیوں کو ہیرو اور ہیروئن بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ ان کے مقابلے عوام کو بیوقوف جاہل نااہل اور فرمانبردار بنا کر دکھایا جاتا ہے۔

دوم وہ ڈرامے جنہیں جدید کہا جاتا ہے۔ ان میں غیر ملکی ڈراموں سے ماخوذ زیادہ اور طبعزاد کم ہیں۔ ان ڈراموں میں بھی حقیقت اور معاشرہ کے مسائل پیش کرنے کے نام پر عوام اور بالخصوص درمیانہ طبقہ کے افراد کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ ان میں حقیقت کو اس انداز سے پیش کیا جاتا ہے جس سے مجموعی طور پر دیکھنے والا مایوسی، شکستگی اور انفرادیت کا شکار ہو۔

سوئم وہ ڈرامے جو جدید بھی ہیں طبعزاد اور ماخوذ بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں مسائل پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے دل کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ان میں عوام دشمن استحصالی طبقوں کو تضحیک کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ان طبقوں کو بے نقاب کیا جاتا ہے۔ ان میں حقیقت کو اس انداز سے پیش کیا جاتا ہے۔ جس سے مجموعی طور پر عوام میں جذبہ خود اعتمادی اور اتحاد اور جوش و ولولہ پیدا ہو۔ ان ڈراموں میں تفریح کے ساتھ ساتھ تعلیمی مقاصد کو بھی مدِنظر رکھا جاتا ہے۔

اوپر بیان کی گئی ڈراموں کی دو اقسام میں ڈرامے لکھنے والوں اور پیش کرنے والوں کا نقطۂ نظر صرف تفریح اور تفریح ہوتا ہے۔ تفریح مہیا کرنے کا فلسفہ ہمارے ملک میں عام طور پر یورپ اور خاص طور پر امریکہ اور برطانیہ سے درآمد کیا گیا ہے قیامِ پاکستان کے تین چار سال بعد امریکی امداد کے ساتھ ساتھ یہ لعنت بھی درآمد کی گئی۔ اور اس کا نام ورائٹی شو رکھا گیا۔ چنانچہ اس زمانہ میں اور بہت بعد تک بڑے شہروں خاص کر کراچی میں بے شمار ورائٹی شو کئے گئے۔ پچھلے تین چار سال میں ورائٹی شو کم ہونے لگے اور رفتہ رفتہ ان کی جگہ کامیڈی ڈراموں نے لے لی۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ خواہ ورائٹی شو ہوں یا کامیڈی ڈرامے۔ پاکستانی فلمیں ہوں یا درآمد شدہ انگریزی جاسوسی سنسنی خیز اور مار دھاڑ سے بھرپور فلمیں۔ ٹی وی پر دکھائی جانے والی انگریزی سیریز یا بہتر ڈرامے۔ ان سب میں تفریح مہیا کرنے کا فلسفہ کام کرتا نظر آتا ہے۔ ناظرین یا عوام کو تفریح مہیا کرنے کا دعویٰ کرنے والے یہ لوگ چاہے ان کا تعلق اسٹیج سے ہو فلم سے یا ٹی وی سے ہو۔ کہتے ہیں کہ دن بھر کام کاج کرنے کے بعد ہر انسان شام کو تفریح چاہتا ہے۔ تاکہ وہ ریلیکس (RELEX) ہو یعنی اس کا اعصابی تناؤ ختم ہو۔ اور صبح پھر تازہ دم اپنے کام پر چلا جائے "مزید یہ کہ" موجودہ معاشرہ میں ہر انسان بے شمار مسائل پریشانیوں اور تفکرات سے گھرا ہوا ہے۔ اگر شام کو بھی ہم اپنے ڈراموں اور فلموں کے ذریعہ اسے نصیحت کرنے بیٹھ جائیں تو سراسر زیادتی ہو گی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ایسی تفریح مہیا کی جائے جس سے وہ تھوڑی دیر کے لئے وہ اپنا غم غلط کر لے یا ان تفکرات کو بھول جائے۔"

تفریح مہیا کرنے کا یہ جواز یقیناً ہمارے ملک کے پانچ فیصد عوام دشمن جاگیردار، سرمایہ دار طبقہ اور ان کے چیڑ قناتیوں کے لئے صحیح ہے۔ اس لئے دن بھر لوٹ کھسوٹ کرنے، ہیرا پھیری رشوت خوری اور بدعنوانی سر کرنے کے بعد شام کو ان تفکرات کو بھولنے اور غم غلط کرنے کے لئے وہ نائٹ کلب میں جا کر ورائٹی شو بھی دیکھتا ہے۔ اور اس میں بھی جاتا ہے۔ فلمیں اور کبھی کبھی ٹی وی بھی دیکھتا ہے۔ اور اس کے لئے یہ تفریح اور عیاشی ہوتی ہے لیکن جو چیز عوام دشمن طبقہ کے لئے تفریح ہے وہ نوے فیصد عوام کے لئے مہلک زہر ہی ہو سکتی ہے اور کچھ نہیں اس لئے کہ عوام اپنے مسائل اور تفکرات کو بھولنا نہیں چاہتے بلکہ وہ ان مسائل اور مشکلات پیدا کرنے والے استحصالی طبقہ کو بے نقاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے خلاف متحد ہو کر ان کو شکست دینا اور اپنے مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا وہ تمام ڈرامے۔ رقص، موسیقی اور فلمیں جن سے پچانوے ۹۵ فیصد عوام میں جوش و ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ جو عوام کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کریں۔ جن سے عوام میں وطن دشمنی، سامراجی پچھوں یعنی مٹھی بھر جاگیردار اور سرمایہ دار طبقوں کے خلاف صف آراء ہونے میں مدد ملے۔ جنہیں دیکھ کر عوام کا شعور بلند ہو۔ عوام کے لئے سب سے بڑی تفریح مہیا کرتے ہیں۔ عوام کی یہ تفریح یقیناً استحصال کرنے والے طبقوں کے لئے مہلک زہر ہی ہو سکتی ہے۔ اور کچھ نہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ عوام میں خرابیاں نہیں ہوتی ہیں لیکن ان پر ہمدردانہ تنقید کرنا ایک بات ہے اور ان کا مضحکہ اڑانا بالکل دوسری بات ہے۔ اکثر ڈرامہ لکھنے والے اور کرنے والے حضرات ہمدردانہ تنقید

سالنامہ

آرٹ اور کلچر کے نام نہاد ادارے نوکر شاہی کی آماجگاہ بن گئے

اور تضحیک کو گڈمڈ کر دیتے ہیں۔ تیسری قسم کے ڈرامے لکھنے والے اور کرنے والے لوگوں کی تعداد کم ہے۔ یعنی اسے اسٹیج اور ٹی وی ڈرامے جن میں عوام کے جذبات۔ احساسات اور جدوجہد کی عکاسی کی گئی ہو اور جن میں مسائل اور ان کے حل کی طرف نشاندہی کی گئی ہو۔ اس قسم کے ڈرامے کرنے والوں میں عون گار آرٹس تھیٹر کراچی پیش پیش ہے۔ اس ادارہ نے گذشتہ ۱۲ سال میں براہ راست اور بالواسطہ بے شمار ڈرامے اسٹیج کئے ہیں۔ ان میں "ذات شریف"، "نیا بخار" "صبح ہونے تک" "راکھ اور انگارے"، "کاغذی شہر" "قصہ جاگنے سونے کا"، "آدھی روٹی ایک لنگوٹی" "چودھویں منزل" "تیرے چمچوں کا کیا ہوگا"، "شمشیر و سنا اوّل" "سفید پوش"، "جیت ہماری ہے" "اس حمام میں" "سونے کی دیواریں اور شیشے کے آدمی"، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے وہ ڈرامے "آدھی روٹی ایک لنگوٹی" اور "تیرے چمچوں کا کیا ہوگا"، کو کھلے میدانوں میں ہزار ہا کی تعداد میں عوام کے سامنے پیش کیا گیا، ایک ڈرامہ "شیشے کے آدمی"، کو ٹیلی ویژن پر بھی دکھایا جا چکا ہے۔ جن لوگوں نے ان میں سے ایک بھی ڈرامہ دیکھا ہے وہ کم از کم اس بات کو ضرور سراہیں گے کہ کراچی میں واحد یہ ادارہ ہے جو تھیٹر کے میدان میں اپنے قیام سے لے کر اب تک اپنے موقف پر قائم رہا ہے۔

تاہم ۱۲ سال کی اس مسلسل جدوجہد کے دوران ان اداروں نے یہ بات شدت سے محسوس کی کہ جہاں ایک طرف ڈرامہ لکھنے اور کرنے والوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوا ہے۔ اور بے شمار خود رو اور باصلاحیت فن کار سامنے آئے ہیں۔ وہاں یہ بھی حقیقت ہے کہ اداکاری۔ ہدایت کاری اور ڈرامہ نگاری کے اعتبار سے بیشتر ڈراموں کا معیار پست یا اوسط درجہ کا رہا ہے۔ حالات کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اب سے دس سال پہلے ہی کراچی۔ لاہور۔ پنڈی اور ڈھاکہ میں ایسی تربیت گاہیں کھل جاتیں جہاں اداکاری، ہدایت کاری اور ڈرامہ نگاری کی باقاعدہ تربیت دی جاتی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ حکومت نے تو خیر اس سلسلہ میں کچھ کیا ہی نہیں لیکن وہ لوگ جو یہاں سے انگلستان اور امریکہ اس فن کی تربیت حاصل کرنے گئے تھے۔ ان میں سے بھی ایک دو تو وہیں آرام کی زندگی بسر کرنے لگے اور بقیہ نے واپس آکر اچھی جگہوں پر ملازمتیں حاصل کرلیں اور عیش و آرام کے دن گزارنے لگے۔ بات یہیں تک رہتی تو کوئی مضائقہ نہ

تھا تھیٹر کے دیوانے خود ہی ہاتھ پاؤں مار کر اپنے بل بوتے پر تھیٹر کو کہیں سے کہیں لے جاتے۔ لیکن ستم تو یہ ہوا کہ یہاں ابتداء ہی سے تھیٹر کی تدریج و ترقی کی راہیں مسدود کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ آخر وہ کون سے عناصر ہیں جنہوں نے پاکستان میں قومی تھیٹر کو پنپنے نہیں دیا۔ بلکہ ایک حد تک نقصان پہنچایا ہے۔ اول افسر شاہی کے وہ افراد جن کے ذمہ ادب، فن تعلیم اور کلچر سے متعلقہ محکمے اور نشر و اشاعت کے شعبے تھے۔ نوابانہ ذہنیت رکھنے والے ان افسر شاہوں نے آرٹ اور کلچر سے صرف وہاں دلچسپی لی جہاں ان کے بھائی بہنیں، بھتیجیاں، بیویاں، سالے اور سالیاں اور وہ خود اپنا شوق پورا کر سکتے۔ لہٰذا چند آرٹ گیلریوں، آرٹس کونسلوں کچھ آرٹ اسکولوں اور ٹی وی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ایوب شاہی کے دور میں آرٹ اور کلچر کے یہ نام نہاد ادارے مکمل طور پر نوکر شاہی اور اس کے چمچوں کی آماجگاہ بن چکے تھے۔ اگرچہ ایوب شاہی ختم ہو چکی ہے۔ لیکن ان اداروں پر ابھی اسی ٹولہ کا قبضہ ہے۔ چنانچہ یہاں اب بھی بیشتر آرٹ کی نمائشیں۔ ڈرامے۔ شام غزل (جدید مجرے) ایسے ہوتے ہیں جن سے صرف پانچ فیصد لوگ تفریح حاصل کر سکتے ہیں۔

دوئم وہ ادیب۔ شعراء۔ ڈرامہ نگار اور دانشور، جو ذہنی اور طبقاتی طور پر جاگیردارانہ اقدار کے حامل تھے ساتھ ہی ایک حد تک انگریزی سامراج کے نظامِ تعلیم کے بھی دلدادہ تھے۔ انہوں نے ابتداء ہی سے خاص طور پر مغربی پاکستان میں یہ بات پھیلائی کہ "ہمارے ہاں ڈرامہ کی روایات ہی نہیں" ان کے علاوہ کچھ اور "دانشور" تھے جو اسلام کا نام لے کر ڈرامے کی روایات سے منکر ہو گئے۔ یہاں تک کہ جن لوگوں نے اپنی جوانی کے دور میں ہندوستان میں تھیٹر کے میدان میں عملاً حصہ لیا تھا۔ انہوں نے یہ بھی موقف اختیار کیا کہ "جو تھیٹر ہندوستان میں اندر سبھا سے پیدا ہوا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں ختم ہو گیا"۔ چنانچہ انہیں لوگوں نے وقتاً فوقتاً حکومت اور افسر شاہی کو پاکستان میں تھیٹر کی نشوونما کے لئے مشورے دینے کے بجائے۔ صرف ماضی کے ڈراموں پر تحقیق کرنے اور ڈرامہ "تاریخ" لکھنے کی لمبی چوڑی اسکیمیں بنائیں۔ ان کے لئے موٹی موٹی رقمیں وصول کیں

ان دونوں عناصر یعنی نوابانہ ذہنیت کے حامل افسران اور ماضی پرست دانشوروں کی تھیٹر دشمنی کے باوجود کراچی۔ لاہور اور راولپنڈی میں چند سرپھروں نے پابندی سے ڈرامے اسٹیج کرنے کی مہم جاری رکھی۔ مجبوراً ایوب حکومت نے ڈرامہ کی ترقی کے لئے آرٹ کونسلوں کے ذریعے تھوڑی بہت مالی امداد دی۔ اس دور میں کچھ ڈرامہ نگاروں، ہدایت کاروں اور ایکٹروں کو تمغے بھی دئے گئے۔ ان تمغوں کے ساتھ دی جانے والی رقم پنشن کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس لئے کہ تمغے اور رقم ملنے کے بعد کچھ حضرات ریٹائر ہو گئے۔ اور کچھ تھیٹر چھوڑ کر ذاتی کاروبار اور زراعت میں معروف ہو گئے۔

تھیٹر کے سلسلہ میں گرانٹ اور تمغے بظاہر حکومتوں کا عمل حوصلہ افزاء، معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس سرپرستی کی قلعی اس وقت کھل جاتی ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ پاکستان کو بنے ہوئے ۲۳ سال ہو چکے ہیں۔ اور اس مدت میں آج تک ملک میں کوئی آڈیٹوریم تعمیر نہ کرایا گیا۔ آج بھی ڈرامہ کرنے پر تفریحی ٹیکس لگایا جاتا ہے۔ آج بھی تقریر کرنا اور جلسہ کرنا ڈرامہ کرنے کی نسبت زیادہ آسان ہے۔ اس لئے کہ کسی بھی مقرر سے تقریر کا متن طلب نہیں کیا جاتا ہے۔ جب کہ ڈرامہ کرنے سے پہلے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور اسپیشل پولیس سے اجازت نامہ حاصل کرنے کے لئے ڈرامہ کا مسودہ سنسر کے لئے پیش کرنا پڑتا ہے۔ آج تک پورے ملک میں کسی بھی یونیورسٹی میں ڈرامہ کا شعبہ قائم نہیں کیا گیا۔ پورے ملک میں کہیں بھی ڈرامہ کی تربیت گاہ نہیں کھولی گئی۔ یعنی ایک ہاتھ سے جو چند معمولی مراعات دی گئیں دوسرے ہاتھ سے انہیں واپس لے لیا گیا۔ مزید برآں گزشتہ تمام حکومتوں کی یہ کوشش رہی کہ قومی تھیٹر کو پھلنے پھولنے کا کوئی موقعہ نہیں دیا جائے۔ ان نامساعد حالات کے باوجود نئی نسل نے قومی تھیٹر کو پروان چڑھایا۔ ڈرامہ کرنے اور دیکھنے والوں کی تعداد میں اور اضافہ ہوا ڈرامہ کی مقبولیت دن بدن زور پکڑتی گئی۔ چنانچہ اس دوران بے شمار ذہین اور باصلاحیت اداکار اور اداکارائیں منظر عام پر آئے۔

تاہم یہ شدت سے محسوس کیا گیا کہ اگر باقاعدہ تربیت کا انتظام ہو تو یہی خود رو باصلاحیت اور ذہین لوگ پاکستان میں قومی تھیٹر کے معیار کو بہت بلند کر سکتے ہیں۔ اس سے نہ صرف تھیٹر کو بلکہ ٹی وی اور فلم والوں کو بے شمار تربیت یافتہ ذہین اور باصلاحیت فن کار مل جائیں گے۔ ان تلخ حقائق کے پیش نظر نیشنل اکیڈمی تھیٹر آرٹس کراچی (ناٹک) کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ناٹک جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ایسی

تفریح کا فلسفہ، عوام دشمن طبقہ اور چپڑ قناتیوں کے لئے صحیح ہے

تربیت گاہ ہے جہاں قومی سائنٹیفک - ترقی پسند اور تخلیقی اداکاری ہدایت کاری اور ڈرامہ نگاری کی باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے - اس میں ابتدائی کورس ایک سال کا اور مکمل کورس دو سال کا ہے -

ناٹک - اسٹیج - ٹی وی اور فلم کے لئے فنکار ہدایت کار اور ڈرامہ نگار تیار کرے گا - جن کا مقصد فن کے ذریعے دولت کمانا نہیں بلکہ عوام کی خدمت کرنا ہوگا۔

ناٹک - غیر ملکی ڈرامہ کی آن صحت مند اور ترقی پسندانہ روایات سے پورا پورا فائدہ اٹھائے گا جن سے قومی تھیٹر کی نشوونما اور ترقی میں مدد ملے -

ناٹک - شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں مسلسل ایسے ڈرامے اسٹیج کرے گا جو پاکستان کے پچانوے فیصد عوام کے جذبات اور احساسات کے آئینہ دار ہوں گے - جن میں عوام دشمن طبقوں کے خلاف عوام کی جدوجہد کی عکاسی ہوگی -

ناٹک - استحصالی طبقوں کے ذریعے عوام میں پھیلائے گئے پست اور فرسودہ خیالات اور توہم پرستی کے خلاف جہاد کرے گا -

ناٹک - ایسے ڈرامے اسٹیج کرے گا جن سے تھیٹر مقبول عام ہو اور جن سے عوام کا شعور بلند ہو تاکہ وہ تاریخ کو آگے بڑھا سکیں - سب جانتے ہیں کہ اس قسم کی تربیت گاہ چلانے کے لئے اچھے خاصے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے - چنانچہ مالی مشکلات پر قابو پانے اور ناٹک کو خود کفیل ادارہ بنانے کے لئے ہم نے ایک علمی اور جامع منصوبہ تیار کیا ہے - اس کی رو سے ناٹک (واقع ۹۸ - بی - سندھی مسلم سوسائٹی بین ڈرگ روڈ کراچی نمبر۳) کے وسیع وعریض لان میں ہر ہفتہ پابندی کے ساتھ ڈرامہ اسٹیج کیا جائے گا جسے صرف ممبران اور ان کے مہمان دیکھ سکیں گے - ممبروں کی اقسام مع سالانہ فیس کی شرح یہ ہیں - (۱) مجرد ۳۰ روپے - میاں بیوی ۵۰ روپے چار افراد پر مشتمل خاندان ۹۰ روپے نوجوان ۲۰ روپے اور طالب علم ۱۰ روپے -)

ناٹک سال میں کم از کم آٹھ یا دس ڈرامے اپنے ممبران کو دکھایا کرے گا - یہ ڈرامے زیادہ تر ناٹک کے نئے اور پرانے طلبہ پیش کریں گے - اس طرح شہر میں ایک جگہ ایسی ہوگی جہاں پابندی سے ہر ہفتہ ڈرامہ اسٹیج ہوتا رہے گا - ساتھ ہی مستقل ڈرامہ دیکھنے والوں کا ایک حلقہ بھی پیدا ہو جائے گا - سال میں اگر ایک ہزار ممبر بھی بن گئے تو ناٹک خود کفیل ادارہ بن جائے گا - یعنی ناٹک کو چلانے والے فن کار طلبہ اور حاضرین ہی ہوں گے - اس سے یقیناً ڈرامہ کو مقبول عام بنانے کے ساتھ ساتھ اس کا معیار بلند کرنے میں بھی بہت مدد ملے گی -

یہ حقیقت ہے کہ ہمارا معاشرہ طبقاتی معاشرہ ہے - جس میں ایک مخصوص طبقہ دوسرے طبقہ پر حکومت کرتا ہے - یہ قانونِ فطرت ہے کہ جو طبقہ برسراقتدار آتا ہے اور اپنا اقتدار قائم رکھنا چاہتا ہے - وہ اپنے لئے معاشرہ میں ذہنی طور پر راہ ہموار کرتا ہے اس میں ثقافتی حربہ موثر ترین حربہ ہے - پاکستان میں گذشتہ تیس سال سے جو مخصوص طبقہ برسراقتدار رہا ہے - وہ کل آبادی کا پانچ فیصد ہے اس مخصوص طبقہ نے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے اور مستحکم کرنے کے لئے پچانوے فیصد عوام کا سیاسی - معاشی اور ثقافتی استحصال کیا ہے - سیاسی میدان میں یہی طبقہ ہمیشہ کہتا رہا کہ پاکستان کے عوام جمہوریت کے اہل نہیں " - چنانچہ پہلی بار عوام کو جب اپنی رائے ظاہر کرنے کا موقع ملا تو اس طبقہ کے جھوٹے دعوے کی پول کھل گئی - ثقافتی میدان میں یہی طبقہ خاص طور پر یہی کہتا رہا ہے کہ ہمارے

عوام اپنے مسائل کو بھولنا نہیں چاہتے، بلکہ استحصالی طبقہ کو بے نقاب دیکھنا چاہتے ہیں

ہاں تھیٹر کی روایات نہیں - تھیٹر مقبول نہیں - کم از کم ویسا نہیں جیسے ۱۹۴۰ء سے پہلے تھا - ذہین آدمی اگر اس سلسلہ میں بھی عوام کو اپنی رائے اظہار کرنے کا موقع ملے اور تھیٹر کی ترقی کے راستے میں حائل مختلف قسم کی پابندیاں ہٹا دی جائیں - تو آپ دیکھیں گے کہ اس مخصوص طبقہ کے جھوٹے دعوے - ایک بار پھر غلط ثابت ہوں گے -

موجودہ اور آنے والے دور میں تھیٹر کیوں اہم ہے - اس لئے کہ ملک میں اکثریت رکھنے والی جماعتوں نے جمہوریت سوشلزم اور غیر طبقاتی معاشرہ قائم کرنے کا پروگرام پیش کیا ہے - اب اگر یہ جماعتیں واقعی اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانا چاہتی ہیں (جو یقیناً ان طبقوں کے مفاد میں ہوگا جو ملک کی ۹۵ فیصد آبادی پر مشتمل ہیں) تو اس کے لئے انہیں ذہنی طور پر راہ ہموار کرنی ہوگی - یعنی عوام کے ذہنوں میں تبدیلی لانی ہوگی - اس لئے کہ جب بھی کوئی ایسا پروگرام جو ۹۵ فیصد عوام کے مفاد میں ہو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جائے گی یقیناً اس کی مخالفت پانچ فیصد طبقہ کی طرف سے ہوگی بعض اوقات یہ مخالفت یا مدافعت شدید صورت اختیار کرے گی - اس وقت عوام کو متحرک اور منظم کرنے کے لئے ثقافتی تحریک سے زیادہ موثر اور کوئی ذریعہ کام نہ آئے گا - اور اس ثقافتی تحریک میں ڈرامہ یا تھیٹر نہایت اہم رول ادا کرے گا - لہٰذا آنے والی حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ فوراً اس سلسلہ میں یہ اقدامات کریں -

ثقافتی امور سے متعلق وزارت ثقافت قائم کی جائے جس کے تحت ریڈیو - ٹی وی فلم کے علاوہ ملک میں ثقافتی ادارے چلانے اور نئے ادارے قائم کرنے کا کام ہو

پاکستان کے ہر بڑے شہر جیسے کراچی، لاہور، پنڈی ڈھاکہ، پشاور، کوئٹہ، چٹاگانگ - ملتان - حیدرآباد، اور چھوٹے شہر میں مقامی تقاضوں کے مطابق آڈیٹوریم یعنی ہال اور کھلے تھیٹر تعمیر کئے جائیں -

ایک عام اعلان کے تحت تمام ڈراموں اور عوامی رقص و موسیقی کے پروگراموں کو تفریحی ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے -

بڑے شہروں میں عوامی فنون کی اکیڈمی اور تھیٹر کی تربیت گاہیں کھولی جائیں - جہاں مستقل فنکار اور ادیب اور ہدایت کار ملازم رکھے جائیں اور جو اپنے پروگرام اور ڈرامے دیہاتی علاقوں میں بھی پیش کریں -

ہر صوبے میں عوامی ثقافتی میوزیم قائم کیا جائے -

ڈراموں پر سنسر شپ ختم کی جائے -

ادبی فنی انعامات (چاہے وہ سرکاری ہوں یا غیر سرکاری) اور تمغات دینے کا سلسلہ بالکل بند کیا جائے اور ان رقومات کو فنِ ادب کی اجتماعی ترویج و ترقی کے پروگرام ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کا کام نوکر شاہی

باقی صفحہ ۹۸ پر ملاحظہ فرمائیں

"الفتح" کا گزشتہ ایک برس پاکستان کی تاریخ کا ایک نازک ترین برس ہے ہم نے اپنے مضامین، نظموں، سیاسی جائزوں اور اداریوں کے ذریعے عوام کو حال کی اندرونی کہانیاں سنائیں اور مستقبل کے بارے میں خبردار کرنے کا منصب شعوری طور پر ادا کیا۔ ہمیں فخر ہے کہ بیشتر معاملات میں ہمارے جائزے درست ثابت ہوئے۔ ہمارا حلقہ اگرچہ مختصر تھا، وسائل مختصر تھے لیکن ہم نے اپنی سوچ کو کبھی پھسلنے نہ دیا۔ اور عوام کی بارگاہ میں ہمیشہ وہی کہا جو ہمارے دل نے محسوس کیا۔ ذیل میں ہم کچھ ایسے اقتباسات نقل کر رہے ہیں۔ جن پر ہمیں بجا طور پر فخر ہے کہ انتخابات کے سلسلے میں ہمارا شروع سے یہ موقف رہا کہ یہ ہمارے مسائل کا حل نہیں ہیں۔ اور ان سے مسئلے حل نہیں ہوں گے۔ حالات نے ثابت کر دیا کہ الیکشن سے مسئلے حل نہیں ہوئے۔ "عوامی لیگ" کے بارے میں ہم نے لکھا تھا کہ یہ مشرقی پاکستان میں غیر صحت مندانہ سیاسی عمل کی پیداوار ہے اور زیادہ دیر تک نہیں چلے گی۔ واقعات نے یہ بھی سچ ثابت کر دکھایا۔ ایک مضمون میں ہمارے ہاں یہ بھی انکشاف کیا گیا تھا کہ محمود علی قصوری نیپ ولی سے الگ ہو جائیں گے۔ ہماری یہ پیشن گوئی بھی جلد ہی پوری ہوگئی۔ اسلام آباد میں نیا آئینی ڈھانچہ تیار ہونے کی خبر جب ہمارے ہاں چھپی تو بعض لوگوں کو بے بنیاد لگی۔ مگر صدر صاحب کی ۲۸ جون والی تقریر سے یہ بات بھی سچ ثابت ہوگئی۔ قند مکرر کے طور پر یہ اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔

ہمارے جائزے درست ثابت ہوئے، پیشینگوئیاں پوری ہوگئیں

"انتخابات سے مسائل حل نہیں ہوں گے" اور حل نہیں ہوئے

الفتح کا پہلا اداریہ

وطنِ عزیز۔ پاکستان ان دنوں جس سیاسی، سماجی اور اقتصادی بحران سے گزر رہا ہے۔ وہ اس کی تاریخ کا سب سے کٹھن دور ہے۔ ۲۳ برس میں استحصالی قوتوں نے جو بھی عوام دشمن سازشیں کیں، عوام دوست قوتوں کی طرف سے تنظیمی فقدان کے سبب جو اجتماعی فرد گزاشتیں ہوئیں۔ افراد طبقاتی شعور نہ ہونے کے باعث جن مجبوریوں کا شکار ہوئے۔ ان گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ہر فرد ہاتھ پاؤں مار کر راستہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہے۔ نگاہیں اجالوں کو ترس گئی ہیں۔ ۲۳ سال میں ایک نسل سے جو گناہ سرزد ہوئے۔ اب دو نسلیں ان کی سزا بھگت رہی ہیں۔

وہ طاقتیں بلکہ طاغوتی طاقتیں جو قیام پاکستان سے پہلے سے ہی انسانی ضمیر کو خریدنے، انسانی ذہن میں انتشار برپا کرنے اور عوام کے استحصال جیسے ناپاک منصوبوں میں الجھی رہی ہیں آج بھی اپنے اسی شیطانی روپ کو دھارے تاریکی اور روشنی کے درمیان دیوار بنی ہوئی ہیں۔ ملک کے حالات اس قدر الجھا کر رکھ دیئے گئے ہیں کہ سب خاکے گڈمڈ ہوگئے ہیں۔ چہرے مسخ ہوگئے ہیں۔ حالات کا تانا بانا الجھ چکا ہے۔ صحیح بات کہنے والے استحصالی قوتوں کے تشدد کا شکار ہیں۔ مذہب کے لبادے میں بدترین قسم کی آمرانہ روش جاری ہے۔ دین کا سہارا لے کر سچی آواز کا بلا تامّل گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔ بے چارے عوام، اپنے محروم و مظلوم ہونے کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ انہیں خبر بھی نہیں ہوتی اور ان کے مقدروں کے سودے بھی طے کر لئے جاتے ہیں۔ علم و فن کے سرچشموں پر تعصب کے سانپ کنڈلی مارے بیٹھے ہیں۔ اظہار کے تمام وسیلے استحصالی قوتوں کے قبضے میں چلے گئے ہیں۔ حق بات کہنے اور حق بات سننے والوں کے درمیان صدیوں کے فاصلے حائل کر دیئے گئے ہیں۔ یہ ایک نئی قسم کی آمریت ہے۔ جو برسر اقتدار طبقے کی "غیر جانبدارانہ" روش کی وجہ سے ایک مفاد پرست اور بہرہ ور طبقے نے اپنے نامعلوم مگر بے پایاں وسائل اور اپنی دولت کے نشے میں بدمست ہو کر مجبور و مقہور عوام پر مسلط کر دی ہے ہر چند کہ آزادیٔ تحریر و تقریر کا ڈھونگ رچا ہے لیکن وطنِ عزیز کی اکثریت تک ہماری باتیں نہیں پہنچ رہی ہیں جو کہنے اور سننے کی ہیں اس کے کیا محرکات ہیں اور اس کا کچھ علاج ہے بھی کہ نہیں؟ یہ سوچنا اور پھر ان جمہوریت دشمن اور انسانیت کش سازشوں کو کچلنے کے لئے فوری قدم اٹھانا، ان ارباب اقتدار کا تاریخی اور قومی فرض ہے جنہوں نے تاریخ کے ایک نہایت نازک مگر فیصلہ کن موڑ پر ملک کی عنان اپنے ہاتھ میں لی قوم نے اور تاریخ نے ان سے جو توقعات وابستہ کی ہیں اور وقت کے ان سے جو تقاضے ہیں۔ وہ صرف اور صرف اسی صورت میں پورے ہو سکتے ہیں کہ اظہار کے تمام وسیلوں پر سے ان بہرہ ور طبقوں کی اجارہ داری ختم کر کے انہیں ہر فرد کے لئے ہر وقت اور ہر پہلو آزاد کر دیا جائے (اداریہ بعنوان مجبور اکثریت، اجارہ دار اقلیت، جلد۔ ۱، شمارہ ۱، مورخہ ۲۰۔۲۸ مئی ۱۹۷۰ء)

"قصوری، ولی نیپ سے الگ ہو جائیں گے"۔ اور الگ ہوئے

اس انتشار کی دوسری بڑی وجہ مغربی پاکستان میں ولی گروپ کے صدر محمود علی قصوری اور پارٹی کی بنیادی پالیسیوں کا ٹکراؤ ہے اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی ہے کہ میاں محمود علی قصوری، ولی خان اور پروفیسر مظفر کے خلاف ایک مضبوط محاذ قائم کر چکے ہیں۔ ۲۹ مئی کو نیپ کی مرکزی کونسل کے اجلاس کا معرکہ قصوری اور ولی خاں کے دھڑوں کے درمیان ہوگا۔ اس بات کا بہت امکان ہے کہ اس اجلاس میں قصوری اپنے پورے دھڑے کو لے کر پارٹی سے علیحدہ ہو جائیں اس کے بعد مغربی پاکستان میں اس گروپ کی سیاسی قوت بالکل ختم ہو جائے گی اور اکتوبر کے انتخابات میں وہ کوئی موثر کردار ادا کرنے کے قابل نہ رہے گا۔ (اسلام آباد سے ایک خط بعنوان قصوری نیپ ولی گروپ سے الگ ہو جائیں گے۔ جلد ۱۔ شمارہ ۲۔ مورخہ ۲۸ مئی۔ ۴ جون ۱۹۷۰ء)

لاڑکانہ سے بھٹو جیت جائیں گے

لاڑکانہ میں پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر ذوالفقار علی بھٹو، سابق وزیر دفاع محمد ایوب خان کھوڑو اور سابق صوبائی وزیر داخلہ قاضی فضل اللہ قومی اسمبلی کی نشست کے لئے انتخابات لڑیں گے۔ بھٹو کی جیت یقینی ہے۔ دادو ضلع میں جی۔ ایم۔ سید اور پیر علی محمد راشدی اپنی سیاسی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کریں گے۔ لیکن دونوں کے لئے دادو کی زمین سخت ہے ان کا ماضی لوگوں کے سامنے ہے (مکتوب سندھ۔ جلد ۱۔ شمارہ ۲۔ مورخہ ۲۸ مئی۔ ۴ جون ۱۹۷۰ء)

الیکشن سے عوام کے مسائل حل نہیں ہوں گے

ہمارے نزدیک عوامی مسائل کا حل صرف اور صرف عوامی جمہوریت کا قیام ہے۔ عوامی جمہوریت کے لئے مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے جو الیکشن سے پہلے الیکشن کے دنوں میں اور الیکشن کے بعد بھی جاری رہنی چاہئے۔ (اداریہ بعنوان الیکشن اور ہمارے بنیادی مسائل۔ جلد ۱۔ شمارہ ۸۔ مورخہ ۹۔ ۱۶ جولائی ۱۹۷۰ء)

انتخابات ملک کے بائیس اجارہ دار سرمایہ داروں، وڈیروں اور جاگیرداروں اور نوکر شاہی کے مظالم سے پیدا ہونے والے مسائل اور مشکلات کے حل میں معاون ثابت نہیں ہوں گے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں اس قسم کا ڈھونگ چہرے بدلنے کے لئے رچایا جاتا ہے۔ اس فریب کاری سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے عوام کو جاگیرداری ختم کرانے کے لئے جدوجہد کو جاری رکھنا ہوگا۔ انہیں اجارہ دار سرمایہ دار اور نوکر شاہی کے مظالم کے خلاف اپنی جنگ کو تیز کرنا ہوگا۔ کیونکہ پارلیمان سے عوام کے مسائل کبھی حل نہیں ہو سکتے (ہالہ کانفرنس کا سیاسی تجزیہ۔ جلد ۱۔ شمارہ ۸۔ مورخہ ۹۔ ۱۶ جولائی ۱۹۷۰ء)

فارلینڈ، سی آئی اے کے ایجنٹ

"الفتح" یہ راز ثبوت کے ساتھ پیش کرنے میں پہل کر رہا ہے۔ ہم آج وہ دستاویز شائع کر رہے ہیں جس کا تمام دنیا میں چرچا ہے۔ یہ دستاویز WHO IS WHO IN C.I.A (سی آئی اے کون کیا ہے) نامی کتاب کا ایک حصہ ہے اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر جولیس میڈر ہیں یہ کتاب مئی ۱۹۶۸ء میں مشرقی برلن میں شائع ہوئی جب کہ مسٹر فارلینڈ ۱۹۶۹ء میں پاکستان کے سفیر متعین ہوئے ہیں اس کتاب کے صفحہ ۱۶۷ کا عکس شامل اشاعت ہے اس صفحہ پر درج ہے۔

فارلینڈ جوزف سپسن

پیدائش۔ ۱۱ اگست ۱۹۱۴ء

ملازمت۔ ۴۴۔ ۱۹۴۲ء میں جاسوسی ادارہ ایف۔ بی۔ آئی، ۴۶۔ ۱۹۴۵ء میں امریکی بحریہ کے ملٹری افسر کو رہا، ۱۹۵۷ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے سفیر اس میں پاکستان میں موصوف کے تقرر کا ذکر اس لئے نہیں کہ کتاب ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی اور وہ ۱۹۶۹ء میں پاکستان میں متعین ہوئے۔ (سی۔ آئی۔ اے میں کون کیا ہے۔ جلد ۱۔ شمارہ ۱۸۔ مورخہ ۱۷ ار۔ ۲۴ ستمبر ۱۹۷۰ء)

ڈھاکہ اور لاہور کی کشمکش

۲۳ سال تک جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور نوکر شاہی نے سامراجی نظام کو بچانے کے لئے جو حربے استعمال کئے اس کی وجہ سے ملک میں فوجی حکومتیں قائم ہوئیں۔ عوامی سوچ کو کچلنے کے لئے عوام دوستوں کا خون بہایا گیا۔ تحریر و تقریر پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ مغربی پاکستان حکمران تھا۔ لاہور کی سیاست پر جاگیرداری چھاپ اجارہ دار کی مہر اور نوکر شاہی کا سکہ تھا۔ اس سے مشرقی پاکستان براہ راست متاثر ہوا۔ مشرقی پاکستان کے درمیانے طبقے اور ابھرتے ہوئے قومی سرمایہ دار نے ۲۳ سال تک مغربی پاکستان کو چھوٹ دی اور مجیب کی شخصیت کو بناتے رہے۔ ایوب آمریت نے اگرتلہ سازش کیس کے ذریعے اس شخص کو کندن بنا دیا۔ دولتانہ اور گول میز کانفرنس کے سازشی رہنماؤں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ مجیب جیل سے باہر نکلے تو عوام نے دیکھا کہ اب سیاست کا مرکز لاہور نہیں ڈھاکہ ہے۔ قوم کی قسمت کا فیصلہ آبادی کی بنیاد پر ہوگا۔ ۵۶ فی صد زیادہ

دیر تک برداشت نہیں کرسکتا ڈھاکہ اور لاہور کی سیاسی کش مکش دو پاکستان کی صورت میں ظاہر ہوگی جلد نمبر ۱ شمارہ ۳۰ مورخہ ۱۰-۱۷ دسمبر ۱۹۷۰ء)

انتخابات منزلِ مقصود نہیں ہیں

ہوشیار! اب جاگتے اور ساتھیوں کو جگائے رکھنے کا مرحلہ ہے۔ یہ اپنے اصلی دشمن کا رخ کر رہا ہے۔ نظروں سے اوجھل رہ کر ہماری صفوں کی جانب آ رہا ہے۔ ہماری صفیں منظم نہ ہوئیں ہم نے اپنے آپ کو اس کے مقابلے کے لئے تیار نہ کیا۔ جدوجہد کی راہ سے گریز کیا۔ مصلحت پسندی سے کام لیا۔ انتخابات میں عوامی فتح کو منزلِ مقصود کا نام دے دیا تو تاریخ یقیناً ہمارے خلاف فیصلہ دے گی۔ ● —— محنت کش اس فیصلے کے لئے تیار نہیں ● —— کسان اس فیصلے کو ٹھکرانے کی ہمت رکھتا ہے۔ طالب علم مشعل لئے ہوئے ہے ● —— مظلوم جاگ اٹھے ہیں۔

اب ہمیں اپنا انقلابی کردار ادا کرنا ہے۔ جدوجہد کی راہ پر گامزن ہونا ہے یہ ثابت کرنا ہے کہ جاگیردار، سرمایہ دار و پائی پائی کا حساب دو ملک مزدور کسان کا ہے۔ طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔ ان کے راستے سے ہٹ کر اب ہماری باری ہے۔

سامراجیو! ایشیا سے نکل جاؤ کہ ہم نے اپنا سورج واپس لے لیا ہے۔ (اداریہ بعنوان جاگتے رہو" جلد نمبر ۱ شمارہ ۳۱ مورخہ ۱۷-۲۴۔ دسمبر ۱۹۷۰ء)

چیئرمین ماؤزے تنگ نے صدر یحییٰ سے کیا کہا؟

عظیم رہنما چیئرمین ماؤزے تنگ نے کہا۔

چینی عوام پاکستان کی خوشحالی اور ترقی میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ جناب صدر! آپ اپنے ملک میں سب سے پہلے فولاد کے کارخانے قائم کرنے کی طرف توجہ دیجئے۔ اس سے نہ صرف عام آدمی کو روزگار مہیا ہوگا۔ بلکہ غیر ممالک کی محتاجی سے نجات مل جائے گی۔ کوشش کا محور یہ ہونا چاہیئے کہ بیرونی امداد کی ضرورت نہ پڑے کسی بھی ملک کا خود کفیل ہونا ضروری ہے۔ چین کے عوام خود کفیل پاکستان کی تعمیر میں پاکستانی عوام کا بھرپور ساتھ دیں گے۔ فولاد کے کارخانے کے قیام کے لئے چین ہر ممکن امداد بہم پہنچانے کو تیار ہے۔

جناب صدر! ہم اپنے دوست کو مضبوط اور طاقتور بہت مضبوط اور بہت طاقتور دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ ہماری دلی خواہش ہے۔ اس میں چین کے عوام کا خلوص شامل ہے ہم ہر حال میں پاکستانی عوام کے ساتھ ہیں۔"

(ہم پاکستان کو مضبوط اور طاقتور دیکھنا چاہتے ہیں" جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۳۴ مورخہ ۷-۱۴۔ جنوری ۱۹۷۱ء)۔

عوامی لیگ زیادہ دیر تک نہیں چل سکے گی

مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ جس اکثریت سے کامیاب ہوئی ہے۔ اس سے عوامی لیگ کی بے پناہ مقبولیت کا نہیں بلکہ مشرقی پاکستان میں صحت مند سیاسی عمل کے فقدان کا اظہار ہوتا ہے۔ اتنا فقدان کہ وہاں کوئی دوسری پارٹی ٹیٹیں ہی حاصل نہ کر سکی۔ یہ تو پارلیمانی تاریخ میں کبھی بھی نہیں ہوا کہ یوں ایک ہی سیاسی پارٹی بلا شرکت غیرے ساری سیٹیں لے جائے اور ایک صوبے کے لوگ ایک ہی سیاسی نظریئے کے حامل ہو جائیں۔ مشرقی پاکستان میں بہت بڑا سیاسی گھپلا ہوا ہے۔ عوامی لیگ کی اس فقید المثال کامیابی کے اسباب پر غور کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ جہاں ایسی کامیابی سیاسی زندگی کے لئے خطرناک ہے وہاں خود عوامی لیگ کے لئے بھی بہت خطرناک ہے ان کھوکھلی بنیادوں پر چلنے والی جماعت عوام میں زیادہ دیر اپنا بھرم نہ رکھ سکے گی۔ صرف ایک برس کے اندر اندر ہی وہ جماعتیں اور تنظیمیں سیاسی سطح پر ابھر آئیں گی جو مزدوروں، کسانوں، طلبہ سے اپنا گہرا رشتہ رکھتی ہیں۔

(مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کب تک جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۳۹ مورخہ ۱۱-۱۸ فروری ۱۹۷۱ء)

آج بھی مسائل کی وہی کھیپ موجود ہے

انتخابات ہونے کے باوجود ہمارے سماج میں مسائل کی وہی کھیپ موجود ہے۔ سماج کی ناہمواریاں بالکل اسی طرح ہیں۔ مٹھی بھر ظالم ملک کی مظلوم اکثریت پر عرصہ حیات تنگ کئے ہوئے ہیں۔ ظلم و تشدد کی وہی ریت ہے اپنے آقاؤں کے خلاف بغاوت کرنے والے مزدوروں اور کسانوں کو اپنے اس جرم کے بدلے میں ظلم و تشدد کا شکنجہ کسا ہوا معلوم ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک بڑی کھلی جنگ لڑنے کے لئے تیار ہیں۔ عوام کے منتخب نمائندوں نے اگر اس مرحلے پر کسی سستی کا مظاہرہ کیا یا موقعہ پرستی اور مصلحت پسندی کو شعار بنایا تو کل عوام کے غیض و غضب کا وہ سب سے پہلے نشانہ بنیں گے۔

زین الدین خاں لودھی سے انٹرویو بعنوان "عوام اپنے مسائل کا حل آج چاہتے ہیں" جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۳۹ مورخہ ۱۱-۱۸ فروری ۱۹۷۱ء)

نیا آئینی ڈھانچہ تیار ہو چکا ہے

پتہ چلا ہے کہ ایک آئینی ڈھانچہ اسلام آباد میں تیار ہو چکا ہے۔ جس میں مرکز اور صوبوں کے اختیارات کی نشاندہی کی گئی ہے اس آئینی مسودہ کی تیاری میں جسٹس کارنیلیس اور دیگر ماہرین قانون کا ہاتھ ہے (جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۵ مورخہ ۲۹ اپریل۔ ۶ مئی ۱۹۷۱ء)

محمود شام

پاکستان میں یہ قہر بھی ہوا کہ اپنے جائز حقوق کے لئے بھوک ہڑتال کے دوران راولپنڈی کے ایک مزدور عبدُ اللہ کا انتقال ہو گیا، مقبوضہ اخبارات میں اس کی خبر چھپی اور بس!

ایک بھوک ہڑتالی کا نوحہ

خُدا تجھے بھی معاف کر دے
خدا ہمیں بھی معاف کر دے
ہماری آنکھوں میں کوئی آنسو
ہمارے لب پر کوئی حکایت
نہ تیری خاطر
نہ اپنی خاطر
خدا تجھے بھی معاف کر دے
خدا ہمیں بھی معاف کر دے
کہ تیرا بھی جرم سانس لینا
ہمارا بھی جرم سانس لینا

تری شہادت پہ قہر ٹوٹا
نہ کوئی طوفان ہی اٹھا ہے
کسی کے لب پر کوئی دعا ہے
کسی جبیں پر کوئی شکن ہے
نہ کوئی مینار ہی گرا ہے
وہی تماشے ہیں شہر در شہر وں
وہی مہکتی ہوئی فضا ہے

کسی کی آنکھوں میں نم نہیں ہے
خدُا تجھے بھی معاف کر دے
خدُا ہمیں بھی معاف کر دے

تجھے گماں تھا کہ زندہ ہیں ہم
ہمارے دل درد کے امیں ہیں
ہمارے سینوں میں ولولے ہیں
ہمارے نعروں میں جراتیں ہیں
ہماری نظروں میں بجلیاں ہیں
تجھے گماں تھا جو نبض ڈوبی
تو قہر بن جائیں گی نگاہیں
تجھے گماں تھا جو پلکیں سمٹیں
دلوں سے طوفاں ابل پڑینگے
تجھے گماں تھا جو سانس ٹھہری
نگر نگر ہم نکل پڑیں گے
تجھے گماں تھا، فقط گماں تھا
خدا تجھے بھی معاف کر دے
خدا ہمیں بھی معاف کر دے

تیری شہادت پہ قہر ٹوٹا
نہ کوئی طوفاں ہی اٹھا ہے
کہ تیرا بھی جرم سانس لینا
ہمارا بھی جرم سانس لینا

گذر چکا تو دمِ سزا سے
ہم اس سزا کو بھگت رہے ہیں
ہمارا یہ جرم، بولتے ہیں
ہم اپنے ہونٹوں کو کھولتے ہیں
جو دیکھتے ہیں وہ لکھ رہے ہیں
جو سوچتے ہیں وہ کہہ رہے ہیں
جو اپنا حق ہے وہ مانگتے ہیں
یہی گناہِ عظیم اپنا
نگاہِ فتویٰ فروش میں بھی
فقیہہ پہ کار کے قریں بھی
مزاجِ شاہی پہ بھی گراں ہے
یہی گناہ عظیم اپنا
یہی متاعِ گراں ہماری

اسی متاع گراں کی خاطر
متاعِ جاں بھی لٹائی تو نے
اسی متاع گراں کی خاطر
ہر اک سزا ہم بھی پا رہے ہیں
نہ ہم پشیماں،
نہ تو پشیماں،
ہزار آندھی، ہزار طوفاں
ہزار فتوے، ہزار نعرے
جو دیکھتے ہیں وہ لکھ رہے ہیں
جو سوچتے ہیں وہ کہہ رہے ہیں
جو اپنا حق ہے وہ مانگتے ہیں
یہی متاع گراں ہماری
یہی گناہِ عظیم اپنا

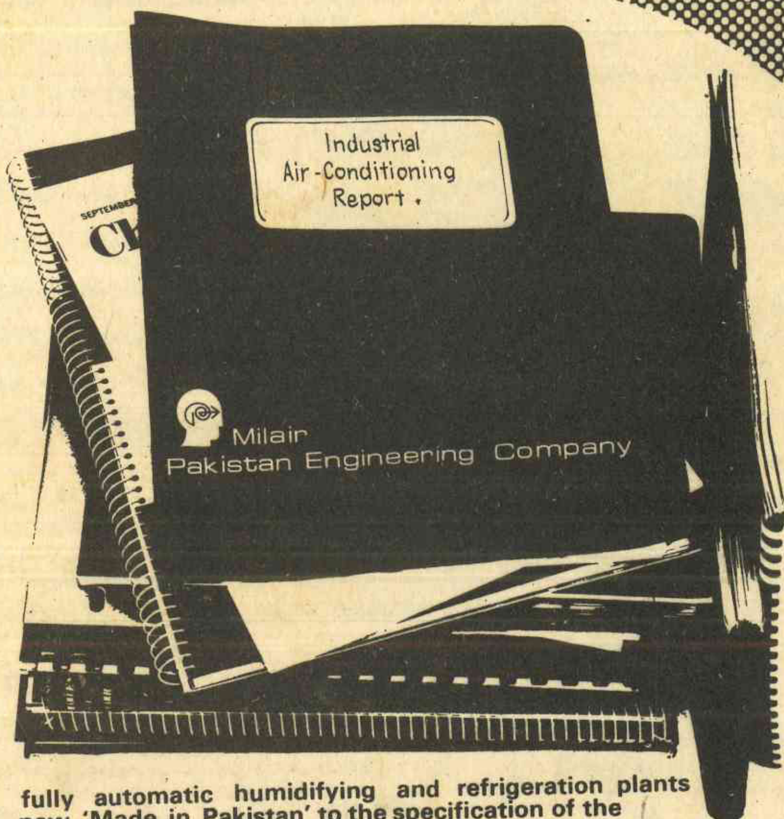
جڑی بوٹیاں — تندرستی کے سرچشمے — صفحہ ۷۹ سے آگے

خریدیں گے۔ ہمدرد کی دوائیں بنیادی طور پر جڑی بوٹیوں سے تیار ہوتی ہیں۔ ان کی اساس یونانی و عربی نظامِ علاج پر قائم ہے۔ جدید سائنس کی زبان میں اسے مرکبات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ان دواؤں میں بہت سے اجزا شامل ہوتے ہیں۔ یونانی طریقِ علاج کا بنیادی اصول ہی یہ ہے کہ اس میں مختلف جڑی بوٹیوں کے امتزاج سے تیار شدہ مرکب کے مجموعی اثر کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے نہ کہ کسی واحد کے اثر کو۔

تمام یونانی دواخانوں میں محض ہمدرد ہی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے جدید سائنسی بنیادوں پر اپنی دواؤں کو معیاری بنایا ہے۔ دواؤں کو کنٹرول کرنے اور انہیں معیاری بنانے کی غرض سے ۱۹۵۸ء میں ایک تحقیقاتی شعبہ قائم کیا گیا۔ اس تجربہ گاہ میں تجربہ اور تحقیق کے لئے جدید ترین آلات فراہم کئے گئے ہیں۔ دواؤں کی تیاری کے سلسلہ میں تمام مال جس میں درآمد شدہ کیمیکل بھی شامل ہیں پہلے تحقیق اور تجزیہ کے مراحل سے گزرتے ہیں۔ پھر انہیں دواؤں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس طرح لیبارٹری اور دواسازی کے شعبے کے درمیان قریبی تعلق قائم کیا گیا ہے۔

درحقیقت ہمدرد کی دواؤں کے سبب زرمبادلہ کی آمدنی کا ایک نیا دروازہ کھل گیا ہے۔ اب یہ دوائیں چھوٹے پیمانے پر مشرقِ بعید اور دیگر ممالک کو برآمد ہونے لگی ہیں۔ ان کی بڑھتی ہوئی مانگ اور روزافزوں مقبولیت کے پیشِ نظر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ یہ دوائیں قومی سرمایہ میں اضافہ کا ایک اہم ذریعہ بن جائیں گی۔

ہمدرد کے عظیم منصوبوں میں یہ منصوبہ بھی شامل ہے کہ مخصوص سائنسی حالات کے تحت جڑی بوٹیوں کی کاشت کی جائے اور ان کا ذخیرہ کیا جائے یہ تمام تر منصوبے طبِ مشرق کی ترقی کی خاطر ہمدرد کی پُرخلوص کوششوں کے آئینہ دار ہیں۔



fully automatic humidifying and refrigeration plants now 'Made in Pakistan' to the specification of the highest international standards

peco

industrial air-conditioning plants

complete climate control
* temperature to taste
* humidity as desired
* air dust-free and pure

That is what your machines need for smooth running, better performance and increased production. And that is what peco makes possible. **That too at competitive rates, part down-payment and very easy instalments.**

If you are planning to build or modernise a factory or an office it is best to plan the air-conditioning for it at the blue-print stage. Consult us and let us plan it for you. Working closely with your engineers and architects we can create the most modern air-conditioning for you and also minimising the cost. Let us be partners in progress.

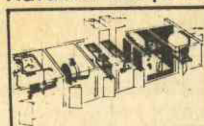


For enquiries write today



Milair
Pakistan
Engineering
Company

I-k, 15, Nazimabad
Karachi 18. phone : 610190



Buy peco and save foreign exchange

TALENT PUBLICITY 71:peco:5

بقیہ :- قومی تھیٹر

کے ہاتھوں ہرگز نہ سونپنا چاہیئے بلکہ اس سلسلہ میں مقامی عوامی ثقافتی اداروں اور عوام کا بھرپور تعاون حاصل کیا جائے ورنہ ان تجاویز کے ماتحت قائم ہونے والے اداروں کا وہی حشر ہوگا۔ جو آج ملک میں نام نہاد نیم سرکاری ثقافتی اور ادبی اداروں کا ہوا ہے۔

یہ تو تھے آنے والی حکومت اور حکومتوں کے فرائض تاہم کچھ فرائض اُن ادیبوں اور فنکاروں اور شاعروں پر بھی عائد ہوتے ہیں۔ جنہیں عرفِ عام میں روشن خیال ترقی پسند اور انقلابی کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر گذشتہ ۲۰ سال سے اپنی ذات (SELF) اور خارجیت کے خول میں بیٹھ کر افسانے ناول۔ غزلیں۔ نظمیں۔ ڈرامے وغیرہ لکھ رہے ہیں۔ اور اب عالم یہ ہے کہ یہ حضرات عوام تو عوام خود اپنے طبقہ یعنی درمیانہ طبقہ سے بھی کٹ کر الگ ہو چکے ہیں ان میں سے بعض حقیقت پسندی کے نام پر جانے یا انجانے پن میں مایوسی اور شکست خوردہ ذہنیت کا پرچار کرتے رہے ہیں۔ موجودہ اور آنے والے دور کا تقاضہ ہے کہ یہ حضرات اپنے خول سے باہر آئیں۔ مزدوروں۔ کسانوں اور عوام سے اپنا رشتہ جوڑیں اور اپنی تخلیقات کے لئے موضاعات عوام میں تلاش کریں اس لئے کہ عوام ہی تمام فن وادب کا سرچشمہ ہیں۔

ان ادیبوں اور دانشوروں سے جو ڈرامہ میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہماری درخواست ہے کہ وہ اپنے "مقام خاص" سے نیچے اتر کر آئیں برے بھلے جیسے بھی ڈرامے اسٹیج ہوں انہیں جا کر دیکھیں ان پر تنقید کریں اور خود نئے نئے ڈرامے لکھیں۔

جہاں تک ناٹک کا تعلق ہے تو ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ ادارہ آج بھی اور آئندہ بھی قومی ترقی پسند تھیٹر کی تحریک کو آگے بڑھانے کی مہم میں پیش پیش رہا ہے اور رہے گا۔ چاہے آنے والی حکومتیں قومی تھیٹر کے سلسلے میں کچھ کریں نہ کریں۔ بہرحال ناٹک کی جد وجہد مستقبل میں بھی اسی جوش وخروش کے ساتھ جاری رہے گی۔ جیسی اب تک رہی ہے۔

ممکن ہے کہ مستقبل میں عالمِ انسانیت، معاشی آزادی اور خوشحالی کے معراج پر پہنچ جائے۔ سامراج کی مسلط کردہ جنگوں سے نجات مل جائے اور تعلیم کے اعلیٰ مدارج طے ہو جائیں تو شاید ایک صحیح جمہوری سوسائٹی کا قیام خواب سے حقیقت بن جائے

بقیہ :- ۲۲ خاندان

(۲۰) ظفر الاحسن

بیسویں نمبر پر ظفر الاحسن گروپ ہے۔ ۱۹۶۵ء میں یہ گروپ ۱۷ ویں سیڑھی پر تھا۔ اس کا سردار بہادر خاں سے بڑا قریبی تعلق ہے۔ اس لئے اس کا شمار بھی گندھارا کی طرح سرحد کے سرمایہ دار طبقہ میں ہوتا ہے۔ اس کے پاس یہ کمپنیاں ہیں۔

(۱) خیبر انشورنس

(۲) خیبر ٹکسٹائل

(۳) انڈس کیمیکلز

(۴) مسترنگ ٹکسٹائل

آج کل انہوں نے قلم کے مزدوروں کے استحصال کے لئے ایک انگریزی روزنامہ بھی نکال لیا ہے۔ اس میں ظلم کرنے کے لئے ملوں کے پرسنل منیجروں کی طرح ایک پرسنل ایڈیٹر رکھا ہے۔ چھانٹی کا عام رواج ہے۔

(۲۱) فتح

فتح گروپ اکیسویں نمبر پر ہے۔ یہ زوال پذیر ہے ۱۹۶۵ء میں اس کی پوزیشن سولہویں تھی۔ ۱۹۶۰ء میں چودہ تھا اور ۱۹۵۵ء میں ساتواں۔ مگر اب یہ گروپ نیچے اُترتے اُترتے اکیسویں نمبر پر آگیا۔

حسب ذیل کمپنیاں اس کے پاس ہیں۔

(۱) بھاولپور ٹکسٹائل ملز

(۲) فتح ٹکسٹائل ملز

(۲۲) دادا

دادا گروپ نے اجارہ دار سرمایہ داروں کی کاروباری ریس میں آخری نمبر یعنی ۲۲ ویں پوزیشن حاصل کی۔ اس گروپ کے کنٹرول میں ایزبسٹوس سیمنٹ ہے۔

یہ ۲۲ خاندانوں کا ایک ہلکا سا تعارف ہے۔ ان اجارہ داروں کے بارے میں آئندہ ہفتے سے ہر سیٹھ کے بارے میں تفصیلات شائع کی جائیں گی۔

جمہوریت؟

بقیہ صفحہ ۶۶ سے آگے

جمہوریت کی جگہ کمیونزم نے حاصل کر لیا ہے۔ کمیونسٹ بھی اپنے آپ کو ایک حقیقی جمہوریت پسند کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ بھی محض خیالی ہے۔ کمیونسٹ ریاستوں میں کھلی ہوئی تنقید اور نہ تحریر و تقریر کی وہ آزادی نہیں ہے جو ایک حقیقی جمہوری ملک میں ہونا چاہیئے۔

امریکہ کے سیاسی حالات دیکھئے۔ یہاں دونوں پر بڑی سیاسی پارٹیوں کو پیشہ ور سیاستدان اور سرمایہ دار کنٹرول کرتے ہیں۔ ہر چار سال کے بعد انتخابات میں امریکی عوام کو انہی پارٹیوں میں سے کسی ایک پارٹی کو ووٹ دینا پڑتا ہے۔ تقریباً ۵۰ فیصد ووٹ ڈیموکریٹ یا ری پبلکن پارٹی کے حق میں جاتے ہیں۔ ووٹ دینے والے مسائل کو سمجھے بغیر آنکھ بند کر کے اپنے فرائض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ ۲۵ فیصد رائے دہندگان کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو الیکشن سے الگ تھلگ رکھتے ہیں۔ امریکہ کے انتخابات کارنیول شو کی طرح ہوتے ہیں جس میں لوگ تماشہ دیکھنے کی غرض سے شریک ہوتے ہیں۔ شو کے خاتمہ پر کسی ایک پارٹی کی کامیابی کا اعلان کیا جاتا ہے اور پھر اس کامیاب پارٹی کے پس پردہ سرمایہ دار ادارے یا افراد چار سال کے لئے اپنا پرانا کھیل دوبارہ شروع کر دیتے ہیں۔ دولت کا ارتکاز، لوٹ کھسوٹ، کرپشن، جرائم کی وارادات، طلاقوں کا طوفانی سلسلہ جاری رہتا ہے۔ امریکہ کا کوئی ایک انتخاب امریکی سوسائٹی کو ان آلودگیوں سے پاک نہ کر سکا۔ ری پبلکن یا ڈیموکریٹس، جانسن یا نکسن صرف لیبل کی تبدیلی کا نام ہے۔ بوتل اور اس کے مادہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

سوویت یونین میں بھی انتخابات کی تقریب بظاہر دھوم دھام سے منعقد ہوتی ہے۔ جلسوں میں تقریریں بھی ہوتی ہیں اور اس کے بعد واحد امیدوار کے حق میں ووٹ ڈالنے کی ہدایت کی جاتی ہے جو کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے کھڑا کیا جاتا ہے۔ ایسا امیدوار قدرتی طور پر ۹۹.۲۵ فیصد ووٹ حاصل کرتا ہے۔ سوویت یونین میں اصل الیکشن کمیونسٹ پارٹی کے اندر ہوتے ہیں جو کل آبادی کے ۴ فیصد سے پر مشتمل ہوتی ہے۔

ہمارے لئے یہ بات ایک قابلِ افسوس امر ہے کہ اس دنیا میں کہیں بھی جمہوریت عملی شکل میں موجود نہیں

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
29 JULY - 5 AUGUST, 1971